سید ابوالاعلیٰ مودودی

مسئلہ ملکیت زمین

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ لاہور۔ ڈھاکہ

مسئلہ ملکیت زمین

سید ابوالاعلیٰ مودودی

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

۱۳- ای، شاہ عالم مارکٹ، لاہور- (مغربی پاکستان)

شاخ:- ۱۶- بیت المکرم، (پہلی منزل) ڈھاکہ (مشرقی پاکستان)

ناشر:- اخلاق حسین، ڈائرکٹر
اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ
۱۳-ای، شاہ عالم مارکٹ لاہور

مطبع (ایور گرین پریس چیمبرلین روڈ۔ لاہور)

اشاعت:-

اوّل	سنہ ۱۹۵۰ء	۳۰۰۰
دوم	سنہ ۱۹۵۴ء	۱۱۰۰
سوم	فروری سنہ ۱۹۶۹ء	۲۰۰۰
چہارم	اپریل سنہ ۱۹۶۹ء	۳۰۰۰

قیمت:- اعلیٰ ایڈیشن ۲۵ ر ۲ روپے
سستا ایڈیشن ۲۵ ر ۱ روپیہ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبعِ اوّل

اب سے پندرہ سولہ سال پہلے کی بات ہے کہ ایک مشہور مصنف کے قلم سے قرآن مجید کی تعلیمات پر ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس میں بہت سی مفید باتوں کے ساتھ کچھ باتیں میرے نزدیک حق کے خلاف بھی تھیں۔ اس پر میں نے ترجمان القرآن کے صفحات میں ایک مفصل تنقید لکھی جو ۱۳۵۳ھ (۱۹۳۴ء) کے ابتدائی پرچوں میں شائع ہوئی۔ پھر وہ تنقید ایک مباحثہ کا موضوع بن گئی اور آگے چل کر ملک کے ایک دوسرے اہلِ قلم بھی مصنف کے ساتھ اس بحث میں شریک ہو گئے۔ ایک سال تک یہ مباحثہ ترجمان القرآن کے صفحات پر جاری رہا جس میں بہت سے مسائل زیرِ بحث آئے۔ من جملہ اِن کے ایک یہ مسئلہ بھی تھا کہ زمین کے معاملہ میں اسلامی قانون کا منشا کیا ہے، آیا وہ اس کو اجتماعی ملکیت بنا دینا چاہتا ہے یا افراد کی شخصی ملکیت ہی میں رہنے دیتا ہے؟ اور اگر شخصی ملکیت ہی میں رہنے دیتا ہے تو کیا اس کو خود کاشتی کی حد تک محدود کر دینا چاہتا ہے یا مزارعت کی اجازت بھی دیتا ہے؟

یہ مباحثہ ترجمان القرآن کے فائلوں میں دفن ہو کر رہ گیا تھا۔ اب جو مجھے جیل کی مستقل فرصت نے پچھلے ناتمام کاموں کی تکمیل کا موقع دیا تو پرانے اوراق میں یہ مباحثہ بھی سامنے آیا اور میں نے محسوس کیا کہ یہ ایک مفید بحث ہے

جس کی ضرورت آج پہلے سے بھی زیادہ ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی محسوس ہوا کہ اب کی ضروریات کے لئے پہلے کی بحث بہت تشنہ ہے۔ اگر صرف اسی کو جوں کا توں شائع کیا جائے تو چنداں فائدہ مند نہ ہوگا۔ اس لئے میں نے اس پر نظرِ ثانی کی، جن جن گوشوں میں خلا محسوس ہوا اُن کو بھرا، اور اس پر بہت سے مزید مباحث کا اضافہ کیا جن کی آج کے لوگوں کو ضرورت ہے۔

اس اصلاح و اضافہ کے بعد یہ مختصر رسالہ ناظرین کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کا صرف پہلا باب (ضروری اصلاحات کے ساتھ) اُس مباحثے پر مشتمل ہے جو ترجمان القرآن کے صفحات میں پہلے شائع ہوا تھا۔ باقی ابواب تازہ اضافہ ہیں۔ اور ان کے مخاطب بھی آج ہی کے لوگ ہیں نہ کہ وہ بزرگ جن سے مباحثہ کا آغاز ہوا تھا۔

نیو سنٹرل جیل ملتان

۹ ربیع الثانی ۱۳۶۹ھ (۲۹ جنوری ۱۹۵۰ء)

(ابو الاعلیٰ)

زمین کی شخصی ملکیّت

از رُوئے قرآن

[جیسا کہ دیباچہ میں بتایا جا چکا ہے یہ ایک مباحثہ ہے جس کا آغاز ایک کتاب پر تنقید سے شروع ہوا تھا۔ اس مباحثے میں حسبِ ذیل اجزا شامل ہیں:۔

(۱) ترجمان القرآن کی تنقید

(۲) مصنف کا جواب

(۳) ترجمان القرآن کا جواب الجواب

(۴) ایک دوسرے اہلِ قلم کی طرف سے مصنف کی تائید

(۵) ترجمان القرآن کا آخری جواب

چونکہ اس بحث کو یہاں نقل کرنے سے مقصود کسی پرانی بحث کو تازہ کرنا نہیں ہے۔ اس لئے نام حذف کر دیئے گئے ہیں]۔

(۱)

مولّف نے سورۂ رحمٰن کی آیت وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ سے یہ حکم نکالا ہے

کہ زمین کی شخصی ملکیت یعنی زمینداری ناجائز ہے ۔ چنانچہ اپنے حاشیہ میں لکھتے ہیں ۔

"زمین کی وراثت کا جہاں جہاں قرآن میں ذکر ہے ۔۔۔۔ اس کے معنی حکومت کے ہیں۔ شخصی ملکیت یعنی زمینداری کے نہیں ہیں۔ قرآن نے بجز حقِ انتفاع کے زمین پر حقِ ملکیت عطا نہیں کیا ہے ۔"

یہاں نکتہ آفرینی کی کوشش میں صاحبِ موصوف صریحاً حق سے تجاوز کر گئے ہیں ۔ انہیں غور فرمانا چاہیئے تھا کہ زمین کی شخصی ملکیت کا دستور نزولِ قرآن کے وقت تمام دنیا میں رائج تھا، صدیوں سے رائج چلا آرہا تھا، اور تمدن کے اساسی دستوروں میں داخل تھا ۔ اگر قرآن کا مقصود فی الحقیقت یہ ہوتا کہ زمین سے انتفاع کے اس پرانے دستور کو بالکل بدل ڈالا جائے اور شخصی ملکیت کی جگہ قومی ملکیت کا طریقہ رائج کیا جائے تو کیا ایسی انقلاب انگیز بنیادی تبدیلی کے لئے وہی زبان موزوں ہو سکتی تھی جو وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ میں استعمال کی گئی ہے؟ ہر شخص بادنیٰ تامّل یہ سمجھ سکتا ہے کہ ایسی اہم اور اساسی اصلاحوں کے لئے محض سرسری اشارے کافی نہیں ہوتے بلکہ صریح احکام دینے ضروری ہوتے ہیں ۔ پھر یہ بھی کافی نہیں ہوتا کہ محض سابق دستور کو مٹا دیا جائے، بلکہ اس کو مٹانے کے ساتھ خود اپنی طرف سے ایک دوسرا دستور بھی پیش کرنا ہوتا ہے ۔ اب کیا جنابِ مصنف یہ بتا سکتے ہیں کہ قرآن نے شخصی ملکیت کا قاعدہ منسوخ کر کے کونسا دوسرا قاعدہ اس کی جگہ مقرر کیا ؟ اور اگر قرآن کا منشا کوئی دوسرا قاعدہ مقرر کرنا ہی تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء راشدین نے شخصی ملکیت کے قدیم دستور کو کیوں باقی رکھا، اور خود لوگوں کو زمینیں کیوں عطا کیں ؟

جس آیت سے جنابِ موصوف استدلال فرما رہے ہیں اس کے الفاظ اور سیاق و سباق پر نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا مقصود کوئی قانون بنانا نہیں ہے، بلکہ خدا کی قدرتوں کا بیان ہے۔ ساری تقریر اس انداز پر ہے:۔

"رحمٰن نے قرآن کا علم دیا، انسان کو پیدا کیا، اُسے بیان کی قوت دی، اُسی کے حکم سے چاند سورج گردش میں ہیں، درخت اور گل بوٹے سب اُسی کے آگے سر بسجود ہیں، اُس نے اُوپر آسمان کو چھا دیا، اور نیچے خلقت کے فائدے کے لئے زمین بچھا دی جس میں میوے اور کھجور کے درخت ہیں، اور طرح طرح کے اناج اور خوشبودار پھول ہیں۔ اب تم اپنے پروردگار کی قدرت کے کن کن کرشموں کو جھٹلاؤ گے؟"

اس تقریر میں تمدنی قانون بیان کرنے کا آخر کونسا موقع تھا؟ اور اس سلسلۂ بیان میں یہ فقرہ کہ "نیچے خلقت کے فائدہ کے لئے زمین بچھا دی" یہ معنی کہاں دیتا ہے کہ زمین پر شخصی ملکیت ناجائز ہے؟ قرآن سے احکام نکالنے کے لئے ضروری ہے کہ آیت کے الفاظ اور اس کے موقع و محل اور سیاق و سباق کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ پھر اس امر کا بھی لحاظ کیا جائے کہ جو قانون ہم اس آیت سے اخذ کر رہے ہیں آیا اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ طیبہ میں عملاً جاری بھی فرمایا تھا یا نہیں؟ اگر معلوم ہو کہ آپ نے ایسا قانون جاری نہیں فرمایا، بلکہ آپ کا عمل اس کے خلاف رہا، تو ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ بادی النظر میں قرآن کا جو مفہوم ہم سمجھ رہے ہیں وہ غلط ہے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس [illegible] بھیجے گئے تھے کہ قرآن میں جو احکام

دیئے گئے ہیں ان پر عمل کر کے بتائیں اور زندگی کے معاملات میں ان کو جاری کریں۔ اگر آپ احکام قرآنی کے مطابق زندگی کے قدیم طریقوں میں اصلاح نہ فرماتے اور الٰہی قوانین کو نافذ کرنے کے بجائے پرانے دستوروں کی پیروی کرتے تو نعوذ باللہ آپ کی بعثت بالکل فضول ہوتی، بلکہ بعثت کا اصل منشا ہی فوت ہو جاتا۔ کم از کم اتنا تو ہر شخص تسلیم کرے گا کہ آنحضرتؐ کا کوئی عمل قرآن کے خلاف نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔

(۲)

مصنف کا جواب

قرآن سے زمین پر شخصی ملکیت کا حق ثابت نہیں۔ اس پر آپ کو اعتراض ہے تو کوئی آیت ثبوت میں نقل کرتے۔ کسی عہد کی تاریخ سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ کیونکہ تاریخ ایک خاص ماحول رکھتی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ ماحول اب نہ ہو۔ دراصل قرآن کریم کے متعلق ہمارے اور آپ کے زاویۂ نگاہ میں فرق ہے۔ ہم قرآن کو ایک مکمل کتاب سمجھتے ہیں جس میں انسان کے جملہ دینی اور دنیاوی مسائل کا حل ہے۔ جس طرح یہ عالم فطرت انسانی معیشت کے لئے ہر طرح مکمل ہے اسی طرح یہ کلام فطرت، یعنی قرآن بھی جملہ عقدہ ہائے معاشرت کو کھول سکتا ہے۔ آج انسانی قومیں انسانی معاشرت کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے بیقرار ہیں اور ان میں قبضۂ زمین کے مسئلہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ اس کی بدولت انسانی برادری میں نہایت غیر مساویانہ دولت کی تقسیم ہوئی ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ قرآن میں اس کا حل نہیں ہے؟ آپ کا خیال ہے۔ [illegible] نے "وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ"

کہہ کر صرف قدرتِ الٰہی کا اظہار کیا ہے۔ مگر ہمارے نزدیک اس قدرتِ الٰہی کا شکریہ ہے کہ ہم اس کے مطابق عمل کریں۔ اسی سورہ میں ہے "وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَآتُ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ (۲۴-۵۵) یعنی اُسی کے ہیں جہاز اونچے کھڑے ہوئے سمندر میں۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ انگریزی اور جاپانی جہازوں کو سمندر میں دیکھ کر آپ قدرتِ حق پر اس کی حمد و ثنا کریں یا خود بڑے بڑے جنگی جہاز تعمیر کر کے سمندر میں ڈالیں؟ بہرصورت کلامِ الٰہی ایک فطری شے ہے جس کے منافع محدود اور متعین نہیں ہوتے۔ اس لئے کسی آیت کے متعلق آپ کا یہ کہنا کہ یہ صرف فلاں غرض کے لئے ہے صحیح نہیں ہو سکتا۔ اگر اس سے دوسرے فائدے حاصل کئے جا سکتے ہیں تو ضرور حاصل کئے جائیں گے۔ یہی حال فطری اشیاء کا ہے۔ بابا آدم پانی کے متعلق یہ تو ضرور جانتے تھے کہ نہانے اور پینے کی چیز ہے۔ مگر فرزندانِ آدمؑ نے اسی پانی سے بڑی بڑی مشینیں، ریلیں اور جہاز چلانے شروع کئے۔ اور ابھی تک اس کا فائدہ محدود نہیں ہے۔ اسی سے "ماءِ ثقیل" نکالا جا چکا ہے جو دنیا کا سب سے قیمتی زہر ہے۔ اور اسی سے پٹرولیم بنانے کا نسخہ بھی تیار ہو چکا ہے۔ بعینہٖ یہی حال آیاتِ قرآنی کا ہے کہ ان کی فہم کو کسی ایک عہد کے ساتھ مخصوص کر دینا روا نہیں ہے۔ وہ ہر عہد میں ایک نیا عالم پیدا کر سکتی ہیں۔

(۳)

ترجمان القرآن کا جواب الجواب

آپ نے اس مسئلہ میں خلطِ بحث کر دیا اور میرے اعتراض کا کوئی جواب نہ دیا۔

آپ نے وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ سے یہ مسئلہ نکالا تھا کہ اس آیت کی رُو سے زمین کی شخصی ملکیت جائز نہیں ہے۔ اس پر میرا اعتراض دو پہلوؤں سے تھا۔

ایک یہ کہ نظامِ تمدن میں ایسی انقلاب انگیز بنیادی تبدیلی کہ زمین کو اشخاص و افراد کی مِلک سے نکال کر اجتماعی ملک بنا دیا جائے، اگر فی الواقع قرآن کے پیشِ نظر ہوتی اور یہی اس کا منشا ہوتا تو وہ اسے محض اُس طرح کے اشاروں میں بیان نہ کرتا جن سے آپ یہ مضمون نکال رہے ہیں بلکہ وہ صاف صاف الفاظ میں پرانے دستور کو بند کرنے کا حکم دیتا اور آئندہ کے لئے واضح طور پر بتاتا کہ زمین سے انتفاع کی کیا صورت وہ رائج کرنا چاہتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اگر قرآن مجید کا منشا یہی تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے مطابق عمل کیوں نہیں کیا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا تو اصل مقصد ہی یہ تھا کہ عقائد، اخلاق، معاشرت، تمدن، معیشت، سیاست، غرض انسانی زندگی کے ہر شعبے کو قرآنی احکام کے مطابق ڈھال کر دنیا کو اسلامی نظام کا نمونہ عملاً دکھا دیں۔ ظاہر ہے کہ آنحضورؐ حالات کی بندگی کرنے کے لئے نہیں بھیجے گئے تھے بلکہ خدا کی بندگی کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے۔ آپؐ کا کام دنیا کی روش پر چلنا نہ تھا، بلکہ دنیا کی روش کو بدل کر قرآن کی بتائی ہوئی روش پر چلانا تھا۔ اب اگر ایک طرف آپؐ کے قول کے مطابق یہ مان لیا جائے کہ قرآن کا مقصد زمین کی شخصی ملکیت کو مٹانا تھا، اور دوسری طرف اس ناقابلِ انکار حقیقت کی طرف نظر کی جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملکیتِ شخصی کے پرانے نظام کو مٹایا نہیں بلکہ اسی کو برقرار رکھا، تو لامحالہ دو باتوں میں سے ایک بات ماننی پڑیگی۔

یا یہ کہ قرآن کے اس مقصد سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بے خبر تھے۔ یا یہ کہ حضورؐ کو اس کا علم تھا مگر آپ نے قرآن کے اِس حکم پر عمل نہ کیا اور قرآن کے بتائے ہوئے ستور پر اُس دستور کو ترجیح دی جو رضائے الٰہی کے خلاف دنیا میں رائج چلا آرہا تھا۔ فرمایئے، اِن دونوں پہلوؤں میں سے کونسا پہلو آپ اختیار کرتے ہیں؟

یہ تھے میرے اعتراضات۔ مگر آپ نے ان کی طرف سرے سے کوئی توجہ ہی نہ فرمائی اور قرآن کے متعلق اپنے زاویۂ نگاہ کی تشریح شروع کر دی۔ اس پر بھی صبر کیا جا سکتا تھا اگر آپ کی اس تشریح سے معاملہ کچھ سلجھ جاتا۔ لیکن افسوس ہے کہ اس نے معاملہ کو اور زیادہ اُلجھا دیا۔

آپ فرماتے ہیں کہ "ہم قرآن کو ایک مکمل کتاب سمجھتے ہیں"۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔ مگر ایسی مکمل کتاب تصنیف کرنے کی یہ سزا تو اللہ میاں کو نہ دیجیے کہ اس کی آیتوں، اور آیتوں کے بھی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو اُن کے سیاق و سباق سے الگ کر کے ان کو وہ معنی پہنانے شروع کر دیں جو نہ صرف اُس سلسلۂ کلام سے، بلکہ پورے قرآن کی تعلیم ہی سے کوئی مناسبت نہ رکھتے ہوں۔ یہ طریقۂ تعبیر و تاویل دنیا کی کسی تقریر و تحریر اور کسی عبارت کے معاملہ میں بھی صحیح نہیں ہے، کجا کہ خدا کی کتاب کو اس کا تختۂ مشق بنایا جائے۔ اگر میں آپ ہی کے مضمون میں سے کسی فقرے کو الگ نکال کر اس سے معنی نکالنے کا وہ طریقہ برتوں جو آپ نے قرآن سے معنی نکالنے کے لئے اختیار فرمایا ہے، تو آپ خود پکار اٹھیں گے کہ یہ مجھ پر اور میری تحریر پر ظلم ہے۔ کلامِ الٰہی تو بے شک کلامِ فطرت ہے، مگر اس کی تفسیر کا جو طریقہ آپ نے اختیار فرمایا ہے وہ تو یقیناً خلافِ فطرت ہے۔

آپ کہتے ہیں کہ انسانی معاشرت کے مسائل میں قبضۂ زمین کے مسئلے کو خاص اہمیت حاصل ہے، کیونکہ اس کی بدولت انسانی برادری میں دولت کی تقسیم نہایت غیر مساویانہ طریقہ پر ہوئی ہے، اس لئے ضروری ہے کہ اس کا حل قرآن نے کیا ہو۔ بالکل بجا ہے۔ واقعی یہ مسئلہ زندگی کے مسائل میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ بڑی معقول بات ہے کہ اس کا حل معلوم کرنے کے لئے قرآن کی طرف رجوع کیا جائے۔ مگر اس کے لئے معقول طریقِ کار یہ ہے کہ آپ خود قرآن ہی سے پوچھیں کہ تقسیم دولت کے متعلق اس کا نظریہ کیا ہے۔ وہ مساویانہ تقسیم کرنا چاہتا ہے یا منصفانہ؟ وہ غیر مساویانہ تقسیم کو مٹانا چاہتا ہے یا غیر منصفانہ تقسیم کو؟ پھر جو بھی اس کا نظریہ ہے اس کے لحاظ سے وہ زمین کے بارے میں شخصی ملکیت کے پرانے دستور کو بالکل بدل ڈالنا چاہتا ہے یا اس کو برقرار رکھ کر اس کے اندر کوئی اصلاح تجویز کرتا ہے؟ اِن مسائل کا کوئی جواب اپنی طرف سے قرآن کے مُنہ میں ڈالنے کے بجائے آپ کو یہ تحقیق کرنا چاہیئے کہ اُس کا اپنا جواب کیا ہے۔ اُس کے جواب پر آپ کا اطمینان ہو تو اُسے قبول کیجئے۔ نہ اطمینان ہو تو اس کو رد کر دیجئے۔ جو دوسرا حل آپ کے نزدیک صحیح ہو اس کی تبلیغ کیجئے اور صاف صاف کہیئے کہ قرآن کا حل میرے نزدیک غلط ہے اور اس کے مقابلہ میں یہ حل میرے نزدیک صحیح ہے۔ لیکن اس معقول طریقہ کے بجائے آپ دولت کی تقسیم کا نظریہ اور طریقہ تو لیتے ہیں مارکس اور لینن سے، اور پھر زبردستی اس کو لاکر ڈالتے ہیں قرآن میں، اور اس طرح دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ اشتراکیت کا نظریہ نہیں بلکہ قرآن کا نظریہ ہے۔ اس صریح زیادتی پر کوئی آپ کو ٹوکتا ہے تو آپ اس کو یہ لکچر دیتے ہیں کہ بابا آدم کے زمانہ میں

پانی کا استعمال کسی اور طرح ہوتا تھا اور اب کسی اور طرح ہوتا ہے، اس وجہ سے قرآن کا طریقِ استعمال بھی اب بدل کر کچھ سے کچھ ہو گیا ہے!

آپ کا ارشاد ہے کہ بیشک سورۂ رحمٰن میں تو "وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ" کا فقرہ اللہ میاں نے اپنی قدرت کے اظہار ہی کے لئے فرمایا ہے، مگر ہمارے نزدیک اس قدرتِ الٰہی کا شکریہ یہ ہے کہ ہم اس کے مطابق عمل کریں" یعنی ساری زمین کو سب "انام" (مخلوقات) کی مشترک ملکیت بنا دیں[1]۔ بڑے ادب کے ساتھ گذارش ہے کہ اگر آیاتِ قرآنی میں تصرّف کا یہ تکلّف دولت کی غیر مساویانہ تقسیم ہی

---

[1] زیرِ تنقید کتاب کے مصنف کا اجتہاد تو اب کئی سال پرانا ہو چکا ہے۔ آج کل کے اشتراکیت زدہ مجتہدینِ اسلام نے قرآن سے ایک اور فقرہ ڈھونڈ نکالا ہے اَلْأَرْضُ لِلّٰهِ، اور اس پر انہوں نے قیاسات کا ایک پورا "کریملن" تعمیر کر ڈالا ہے۔ حالانکہ وہ پوری آیت جس میں سے یہ ٹکڑا نکالا گیا ہے ان کے منشا کے بالکل برعکس معنی دے رہی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:۔ إِنَّ الْأَرْضَ لِلّٰهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۞ (الاعراف ۱۲۸) "زمین خدا کی ہے، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے۔" پھر اگر بالفرض قرآن میں صرف اتنا ہی فقرہ ہوتا کہ اَلْأَرْضُ لِلّٰهِ، تب بھی تو اُس کو یہ معنی پہنانے کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ زمین افراد کی ملکیت نہ ہو بلکہ قوم یا اسٹیٹ کی ملکیت ہو۔ اس طرح کی من مانی تاویلیں کرنے پر کوئی اُتر آئے تو کہہ سکتا ہے کہ سرے سے دنیا کی کوئی چیز بھی شخصی ملکیت نہ ہونی چاہیئے کیونکہ اللہ میاں نے صاف کہہ دیا ہے کہ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ "آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے"۔

کو مٹانے کے لئے فرمایا گیا ہے تو اس مقصد کیلئے سورۂ رحمٰن کی اس آیت کے بجائے سورۂ بقرہ کی وہ آیت اچھی تختۂ مشق ثابت ہو سکتی تھی جس میں اللہ میاں یہ کہہ گزرے ہیں کہ:-

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا۔

"پیدا کیا تمہارے لئے وہ سب کچھ جو زمین میں ہے"

اس آیت پر اگر آپ اپنا طریقِ تفسیر استعمال فرماتے تو اس سے یہ حکم نکل سکتا تھا کہ نہ صرف زمین بلکہ روپیہ پیسہ، (جس میں آپ نے بھولے سے قانونِ میراث کے اجراء کو تسلیم کر لیا ہے)، روٹی، کپڑا، برتن، جانور (جن پر شخصی ملکیت کا حق تسلیم کرنے کی غلطی بھی آپ سے سرزد ہو گئی ہے)، مکان، سواری غرض سب ہی کچھ شخصی ملکیت سے نکال کر اجتماعی ملکیت بنا دیا جائے۔ اس تدبیر سے ایک ہی ہلہ میں دولت کی غیر مساوی تقسیم کا قصہ بھی پاک ہو جاتا اور اللہ میاں کا شکریہ بھی ادھورا نہ رہ جاتا۔

آپ کا یہ نظریہ بھی بڑا ہی عجیب و غریب ہے کہ قرآن کا منشا متعین کرنے کیلئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو فیصلہ کن نہ مانا جائے۔ میں نے جو عرض کیا تھا کہ ہمیں کسی آیت سے کوئی قانون اخذ کرتے ہوئے یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس پر عمل درآمد ہوا ہے یا نہیں، اس کے جواب میں آپ فرماتے ہیں کہ "کسی عہد کی تاریخ سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا" یہ جواب ارشاد فرماتے وقت شاید آپ نے غور نہیں کیا کہ اس کے منطقی نتائج کیا ہیں۔ اگر ہم ایک طرف یہ بات مان لیں کہ قرآن کا اصل منشا زمین کو شخصی ملکیتوں سے نکال کر اجتماعی ملکیت بنا دینا تھا، اور دوسری طرف اس امر واقعہ کو دیکھیں کہ یہ کام نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانۂ حکومت میں کیا، نہ خلفائے راشدین نے اپنے دور میں کیا،

نہ صحابہ، تابعین، ائمۂ مجتہدین، اور پچھلے تیرہ سو برس کے فقہائے امت میں سے کسی نے اس کا خیال تک ظاہر کیا، تو لامحالہ پھر ہمیں دو باتوں میں سے ایک بات ماننی پڑے گی۔ یا تو یہ کہ قرآن کو اس کے لانے والے پیغمبر سے لے کر پوری اُمتِ مسلمہ کے علماء و فقہاء اور ائمہ تک کسی نے نہ سمجھا، اور اس کے فہم کی سعادت نصیب ہوئی تو مارکس، اینجلز، لینن اور اسٹالین کو ہوئی۔ یا پھر قرآن کے منشا کو سمجھ تو گئے تھے رسولؐ اور صحابہ بھی، مگر عمل کی توفیق اُن کے بجائے رُوس کے اشتراکی کامریڈوں کو نصیب ہوئی! قرآن کے منشا کا مسئلہ عہدِ رسالت کی تاریخ سے حل نہ ہوگا تو پھر وہ یوں حل ہوگا۔ کیا واقعی آپ اس پر راضی ہیں؟

(۴)

ایک دوسرے اہلِ قلم کی طرف سے مصنف کے نظریہ کی تائید

اس میں تو شک نہیں کہ صاحبِ تعلیمات نے جس آیت سے یہ مسئلہ استنباط کیا ہے وہ اساسی قانون کی بظاہر حامل نظر نہیں آتی لیکن اس کے خلاف ملکیتِ زمین کی تائید میں بھی تو کوئی آیت آپ نے نقل نہیں فرمائی۔ اب اس بارہ میں رسولؐ اللہ کا اُسوۂ حسنہ ہی قولِ فیصل ہوگا۔ میری محدود نظر نے جہاں تک کام کیا ہے، مَیں تو دیکھتا ہوں کہ احادیثِ مقدسہ سے بھی صاحبِ تعلیمات کی اس تاویل کی تائید ہو رہی ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری شریف میں یہ روایات ہیں (کتاب المزارعہ باب کراء الارض)۔

(۱) عن رافع بن خدیج ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھٰی عن کراء الارض۔

حضرت رافع بن خدیج سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین

کا لگان لینے سے منع فرمایا۔

(۲) عن جابر قال کانوا یزرعونہا بالثلث والربع والنصف فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من کانت لہ ارض فلیزرعہا او لیمنحہا۔

"حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ہم زمین کو تہائی، چوتھائی اور نصف کی بٹائی پر دیدیا کرتے تھے۔ نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ جس کے پاس زمین ہو وہ یا تو خود جوتے یا دوسرے کو دیدے۔"

(۳) عن ابی ھریرۃ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من کانت لہ ارض فلیزرعہا او یمنحہا اخاہ۔

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جس کے پاس کوئی زمین ہو وہ خود اس کو جوتے یا اسے اپنے بھائی کو دیدے۔"

اس کے علاوہ رافعؓ بن خدیج سے ہی ایک اور روایت ہے جس میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ ان کے چچا زمین کو پیداوار کی چوتھائی اور چند وسق کھجور اور جَو کے عوض دے دیا کرتے تھے۔ نبی اکرمؐ نے انہیں اس سے منع فرمایا اور فرمایا خود کاشت کرو یا دوسرے کو کاشت کیلئے دے دو یا روکے رکھو۔

اس کے ساتھ ہی حضرت ابن عمرؓ کا یہ واقع بھی بخاری میں درج ہے کہ وہ نبی اکرمؐ کے زمانہ سے لے کر حضرت معاویہؓ کے ابتدائی زمانے تک زمین کو کرایہ پر دیا کرتے تھے اس وقت انہیں رافعؓ بن خدیج کی روایت کردہ حدیث پہنچی۔ انہوں نے رافعؓ بن خدیج سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ واقعی نبی اکرمؐ نے زمین کو کرایہ پر دینے سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس کے بعد اپنی زمینیں کرایہ پر دینی موقوف کر دیں۔

ممکن ہے میں ان احادیثِ مقدسہ کا صحیح مفہوم نہ سمجھ سکا ہوں۔ اس لئے اس کے

متعلق بھی وضاحت فرما دیجیے۔ لیکن اگر ان کا یہی مفہوم ہے جو بظاہر معلوم ہوتا ہے تو ان تصریحات کی روشنی میں صاحبِ تعلیمات عادم ملکیتِ اراضی کے نتیجہ پر پہنچ جائیں تو میرا خیال ہے کہ انہیں محض اشتراکیت کے خیال سے مرعوب تصور کر لینا درست نہ ہوگا۔ اشتراکیت کے ثبوت میں تو وہ بخاری شریف کی اس حدیث کو اور بھی قوی دلیل سے پیش کر سکتے ہیں جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ:-

نحن لا نورث ما ترکنا صدقۃٌ۔

"ہم (انبیاء) سے وراثت نہیں ملتی ہے۔ ہم جو کچھ چھوڑتے ہیں صدقہ ہے۔

اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام حضرات انبیاء کرام اس حد تک فطرتاً کمیونسٹ تھے[۱]

---

[۱] یہ ایک غیر متعلق بحث ہے جو محترم ناقد نے یہاں چھیڑ دی ہے، اس لئے ہم اس پر اصل مباحثے کے سلسلے میں تو گفتگو نہیں کر سکتے۔ لیکن اس اندیشے سے کہ خواہ مخواہ کا ایک شبہ لوگوں کے دلوں میں نہ پڑ جائے حاشیئے میں اس کو مختصراً صاف کئے دیتے ہیں:-

واقعہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذاتی املاک اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی دولت کو تو نبوت کے ابتدائی دس گیارہ سال میں خرچ کر چکے تھے، اور تبلیغِ دین کی مصروفیت نے آپ کیلئے اس امر کا بھی کوئی موقع باقی نہ چھوڑا تھا کہ اپنی کسبِ معاش کے لئے کچھ کر سکیں۔ اس کے بعد مکہ کے آخری اور مدینہ کے ابتدائی دور میں آپ کی معیشت کا انحصار اُن فتوح پر رہا جو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے آپ کو عطا کرتا تھا۔ پھر جب اسلامی حکومت کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تو ایک طرف حکمران کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے نبی نظیر کی

(باقی بر صـ۲۲)

فے میں آپ کا حصہ مقرر فرما دیا، اور دوسری طرف خیبر اور فدک کی زمینوں میں، جن کو مالِ غنیمت کے طور پر تقسیم کیا گیا تھا، دوسرے شرکاءِ جنگ کے ساتھ آپ کو بھی حصہ ملا۔ اِن میں سے پہلے حصے کے متعلق حضورؐ نے جو ہدایت فرمائی وہ یہ تھی کہ:۔

اِنَّ اللہ اذا اطعم نبیاً طعمۃ فھی للذی یقوم من بعدہٖ۔

(ابو داؤد)

"یعنی اللہ تعالیٰ کسی نبی کو بسر اوقات کے لئے جو ذریعۂ معاش عطا کرتا ہے وہ اس کے بعد اُس شخص کا حصہ ہے جو اس کی جگہ اس کا کام سنبھالے۔"

اور دوسرے حصے کے متعلق حضورؐ نے فرمایا:۔

نحن لا نورث، ما ترکنا صدقۃ۔

"ہم لوگ وراثت نہیں چھوڑا کرتے، جو کچھ بھی ہم چھوڑیں وہ صدقہ ہے۔" (بخاری)

اس کی وجہ ذرا سا غور کرنے سے بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ حضورؐ نے اسے صدقہ کیوں کر دیا اور پچھلے تمام انبیاء کا طریقہ یہ کیوں رہا ہے کہ نبوت کے زمانے کی کمائی کو وہ صرف بسر اوقات ہی کا ذریعہ بناتے تھے، ذاتی ملک بنا کر میراث میں منتقل نہ کرتے تھے۔ انبیاء علیہم السلام کو جس نازک منصب پر اللہ تعالیٰ قائم کرتا تھا اس کا تقاضا یہ تھا کہ ان کی اپنی ذات ایسے ہر شبہ سے بالاتر رہے کہ وہ یہ کام اپنی کسی ذاتی غرض سے کر رہے ہیں۔ اسی لئے ہر نبی کی زبان سے اللہ تعالیٰ یہ اعلان کراتا تھا کہ:۔

لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ۔

"میں تم سے اس کام پر کوئی اجر نہیں چاہتا۔ میرا اجر تو صرف اللہ کے ذمہ ہے۔"

پس حضورؐ کا یہ صدقہ اس بنیاد پر تھا کہ آپ زمانۂ رسالت کی کمائی کو اجرِ رسالت بنانا پسند نہ فرماتے تھے۔ اس چیز کو "کمیونزم" سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔

(۵)

ترجمان القرآن کا آخری جواب

آپ تسلیم کرتے ہیں کہ مصنف نے جس آیت سے ملکیتِ زمین کا عدمِ جواز ثابت کرنا چاہا ہے، وہ کوئی قانون بنانے والی آیت نہیں ہے۔ لیکن اس کے بعد آپ مجھ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ تم ملکیتِ زمین کے جواز ہی میں کوئی آیت پیش کرو۔ قبل اس کے کہ میں آپ کے اس مطالبہ کو پورا کروں، میں یہ قاعدۂ کلیہ آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ جب کسی رواجِ عام کے متعلق سکوت اختیار کیا جائے تو اس کو ہمیشہ رضا اور جواز ہی پر محمول کیا جائے گا۔ مثال کے طور پر اگر کسی جگہ لوگوں نے کسی زمین کو گزرگاہ بنا رکھا ہو، اور وہاں کوئی نوٹس اس فعل کی ممانعت کے لئے نہ لگایا گیا ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہاں راستہ چلنا جائز ہے۔ اس جواز کے لئے کسی اثباتی اجازت کا ہونا ضروری نہیں ہے، اس لئے کہ وہاں ممانعت کا نہ ہونا خود ہی اجازت کا مفہوم پیدا کر رہا ہے۔ اسی طرح زمین کی ملکیت کا مسئلہ بھی ہے۔ اسلام سے پہلے ہزاروں سال سے دنیا میں یہ دستور جاری تھا۔ قرآن نے اس کی ممانعت نہ کی۔ کوئی صریح حکم اس کے موقوف کرنے کے لئے نہ دیا۔ کوئی دوسرا قانون اس کی جگہ لینے کے لئے نہ بنایا۔ کہیں اشارۃً اس رواج کی مذمت تک نہ کی۔ اس کے معنی یہی تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پرانے دستور کو جائز رکھا، اور یہی معنی لے کر مسلمان نزولِ قرآن کے بعد سے اب تک زمین کو اسی طرح شخصی ملکیت بناتے رہے جس طرح اس سے پہلے وہ شخصی ملکیت بنائی جاتی رہی تھی۔ اب اگر کوئی اس کے عدمِ جواز کا قائل ہے تو اسے عدمِ جواز کا ثبوت دینا چاہیئے، نہ یہ کہ وہ ہم سے جواز کا ثبوت مانگے۔

لیکن بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ قرآن نے پرانے دستور کو موقوف نہیں کیا بلکہ اگر آپ قرآن کا غائر مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس نے ایجاباً اسے جائز تسلیم کیا ہے اور اُسی کی بنیاد پر معیشت اور معاشرت کے متعلق احکام دیئے ہیں۔

دیکھئے، زمین سے انسان کی دو ہی اغراض وابستہ ہیں۔ یا زراعت، یا سکونت۔ قرآن ان دونوں اغراض کے لئے زمین کی شخصی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے۔ سورۂ انعام میں ہے:۔

كُلُوا مِنْ ثَمَرِهٖ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهٖ۔ (آیت ۱۴۱)

"اس کے پھلوں میں سے کھاؤ جبکہ وہ پھل لائے اور اس کی فصل کٹنے کے دن اُس کا (یعنی خدا کا) حق ادا کرو۔

یہاں خدا کا حق ادا کرنے سے مراد زکوٰۃ و صدقہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر زمین اجتماعی ملکیت ہو تو نہ زکوٰۃ دینے کا سوال پیدا ہوتا ہے نہ لینے کا۔ یہ حکم صرف اسی بنیاد پر دیا جا سکتا تھا جبکہ کچھ لوگ زمین کے مالک ہوں اور وہ اس کی پیداوار میں سے خدا کا حق نکالیں، اور کچھ دوسرے لوگ زمین کے مالک نہ ہوں، اور ان کو پیداوار کا وہ حصہ دیا جائے جو خدا کے لئے نکالا گیا ہو۔ فرمائیے، یہ حکم دے کر قرآن نے ملکیت زمین کے پرانے نظام کی توثیق کی یا نہیں؟ اسی کی تائید ایک دوسری آیت سے ہوتی ہے:۔

يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْأَرْضِ۔ (بقرہ ۳۷)

"اے ایمان لانے والو! خرچ کرو اپنی پاک کمائیوں میں سے اور ان چیزوں

میں سے جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالی ہیں "

یہاں زمین کی پیداوار میں سے خرچ کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اس کے متعلق سب کا اتفاق ہے کہ اس سے مراد زکوٰۃ و خیرات ہے۔ اس حکم کی بجا آوری وہی شخص کرے گا جو پیداوار کا مالک ہوگا، اور انہی لوگوں پر یہ انفاق کیا جائے گا جو صاحبِ مال و جائداد نہیں ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ خیرات کے مستحق کون ہیں۔ لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ (البقرہ-۲۷۳) اور إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ ... الخ (التوبہ-۶۰)

رہی دوسری غرض تو اس کے متعلق سورۂ نور میں ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّىٰ تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا .... فَإِن لَّمْ تَجِدُوا فِيهَا أَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوهَا حَتَّىٰ يُؤْذَنَ لَكُمْ۔ (النور: ۲۷-۲۸)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہو جب تک کہ پوچھ نہ لو، اور جب داخل ہو تو اُس گھر والوں کو سلام کرو ..... اور اگر وہاں کسی کو نہ پاؤ تو اندر نہ جاؤ تاوقتیکہ تم کو ایسا کرنے کی اجازت نہ دی گئی ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن سکونت کے لئے بھی زمین کے شخصی قبضہ و ملکیت کی توثیق کرتا ہے اور ایک مالک کے اس حق کا استقرار کرتا ہے کہ کوئی دوسرا شخص اس کی اجازت کے بغیر اس کے حدود میں قدم نہ رکھے۔

اب حدیث کی طرف آیئے مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ نے قرآن کے منشا

کی تعیین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو قولِ فیصل تسلیم کیا ہے۔ مگر اس بات پر تعجب بھی ہوا کہ جو حدیثیں آپ نے نقل فرمائی ہیں اُن کو آپ حضرت مصنّف کی تاویل کا مؤید قرار دے رہے ہیں، حالانکہ وہ سب زمین کی شخصی ملکیت کو ثابت کر رہی ہیں اور ان میں سے کسی ایک کا منشا بھی یہ نہیں ہے کہ زمین کو افراد کے قبضے سے نکال کر اجتماعی ملکیت بنا دیا جائے۔ البتہ ان احادیث کی بنا پر یہ غلط فہمی ضرور پیدا ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کرایۂ زمین (یعنی لگان) اور مزارعت (یعنی بٹائی) سے منع فرمایا ہے، اور یہ کہ حضورؐ کا منشا یہ تھا کہ ہر شخص کے پاس بس اتنی ہی زمین رہے جسے وہ خود کاشت کر سکتا ہو۔ لیکن جیسا کہ میں عنقریب بتاؤں گا، یہ غلط فہمی بھی صرف اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ آدمی کسی جگہ سے چند حدیثیں نکال کر اُن سے ایک معنی اخذ کر بیٹھتا ہے۔ ورنہ اگر بحیثیتِ مجموعی اس مسئلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام ارشادات، اور آپ کے عہد کے عمل، اور زمانۂ خلفائے راشدینؓ کے عمل کو دیکھا جائے، اور یہ دیکھا جائے کہ عہدِ نبوت سے قریب زمانہ کے ائمہ نے قرآن، حدیث، اور آثارِ صحابہؓ پر جامع نگاہ ڈال کر زمین کے بارے میں اسلام کا قانون کیا سمجھا تھا، تو اس امر میں قطعاً کسی شک کی گنجائش نہیں رہتی کہ اسلام صرف یہی نہیں کہ زمین کی شخصی ملکیت کو جائز رکھتا ہے، بلکہ وہ اس ملکیت پر کوئی حد بھی نہیں لگاتا، اور مالک زمین کو یہ حق دیتا ہے کہ جس زمین کو وہ خود کاشت نہ کرتا ہو، اسے وہ دوسرے کو مزارعت یا کرایہ پر دیدے۔

آئیے اب ذرا ہم اس مسئلے میں قانونِ اسلامی کے اصل مآخذ کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیں۔

زمین کی شخصی مِلکیت

از رُوئے حدیث

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ کے عہد میں زمین کا انتظام کس طریقے پر کیا گیا تھا، اس کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ شریعت کی رُو سے اسلامی حکومت کے زیرِ حکم آنے والی اراضی چار بڑی اقسام پر منقسم ہوتی ہیں:-

(۱) وہ جن کے مالک اسلام قبول کر لیں۔

(۲) وہ جن کے مالک اپنے دین پر ہی رہیں مگر ایک معاہدے کے ذریعہ سے اپنے آپ کو اسلامی حکومت کی تابعیت میں دیں۔

(۳) وہ جن کے مالک بزورِ شمشیر مغلوب ہوں۔

(۴) وہ جو کسی کی ملک میں نہ ہوں۔

اِن میں سے ہر ایک کے متعلق آنحضرتؐ اور آپؐ کے خلفاءؓ نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا تھا، اسے ہم الگ الگ بیان کریں گے۔

قسمِ اوّل کا حکم

پہلی قسم کی املاک کے معاملہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس اصول پر عمل فرمایا وہ یہ تھا:-

إِنَّ القوم اذا اسلموا احرزوا دماءهم واموالهمؑ (ابوداؤد، کتاب الخراج، باب فی اقطاع الارضین)

"جب لوگ اسلام قبول کرلیں تو وہ اپنی جانوں اور مالوں کو محفوظ کرلیتے ہیں"

انہ من اسلم علی شئی فھولہٗ۔ (کتاب الاموال لابی عبید)

"آدمی اسلام قبول کرتے وقت جن املاک کا مالک تھا وہ اسی کی ملک رہیں گی"

یہ اصول جس طرح املاکِ منقولہ پر چسپاں ہوتا تھا اسی طرح غیر منقولہ پر بھی چسپاں ہوتا تھا، اور اس معاملہ میں جو برتاؤ غیر زرعی جائدادوں کے ساتھ تھا وہی زرعی جائدادوں کے ساتھ بھی تھا۔ حدیث اور آثار کا پورا ذخیرہ اس پر شاہد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب میں کسی جگہ بھی اسلام قبول کرنے والوں کی املاک سے ذرہ برابر کوئی تعرض نہیں فرمایا۔ جو جس چیز کا مالک تھا اسی کا مالک رہنے دیا گیا۔ اس باب میں اسلامی قانون کی تشریح امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"جو لوگ اسلام قبول کرلیں اُنکا خون حرام ہے۔ قبولِ اسلام کے وقت جن اموال کے وہ مالک ہوں وہ انہی کی ملک رہیں گے اسی طرح ان کی زمینیں بھی ان ہی کی ملک رہیں گی اور وہ زمینیں عشری قرار دی جائیں گی۔ اس کی نظیر مدینہ ہے جس کے باشندوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور وہ اپنی زمینوں کے مالک رہے

اور اُن پر عُشر لگا دیا گیا۔ ایسا ہی معاملہ طائف اور بحرین کے لوگوں سے بھی کیا گیا۔ اسی طرح بدویوں میں سے بھی جن جن لوگوں نے اسلام قبول کیا وہ اپنے اپنے چشموں اور اپنے اپنے علاقوں کے مالک تسلیم کئے گئے ..... اُن کی زمین عُشری زمین ہے۔ وہ اُس سے بے دخل نہیں کئے جا سکتے، اور انہیں اس پر بیع اور وراثت کے جملہ حقوق حاصل ہیں۔ بالکل اسی طرح جن علاقوں کے باشندے اسلام قبول کرلیں وہ اپنی املاک کے مالک رہیں گے۔" (کتاب الخراج صفحہ ۳۵)

اسلامی قانونِ معیشت کے دوسرے جلیل القدر محقق امام ابو عبید القاسم بن سلاّم لکھتے ہیں:۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء سے جو آثار ہم تک پہنچے ہیں وہ اراضی کے بارے میں تین قسم کے احکام لائے ہیں۔ ایک قسم اُن اراضی کی جن کے مالک اسلام قبول کرلیں۔ تو قبولِ اسلام کے وقت وہ جن اراضی کے مالک ہوں وہ اُن ہی کی مِلک رہیں گی اور وہ عشری زمینیں قرار پائیں گی۔ عُشر کے سوا اُن پر اور کچھ نہ لگے گا۔ ..."

(کتاب الاموال۔ صفحہ ۵۵)

آگے چل کر پھر لکھتے ہیں:۔

"جس علاقے کے باشندے اسلام لے آئے وہ اپنی زمینوں کے مالک رہے، جیسے مدینہ، طائف، یمن، اور بحرین۔ اسی طرح مکّہ اگرچہ بزورِ شمشیر فتح ہوا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے باشندوں پر

احسان کیا اور ان کی جانوں سے تعرض نہ کیا اور ان کے اموال کو غنیمت نہ ٹھیرایا . . . . پس جب ان کے اموال ان کی ملک میں چھوڑ دیئے گئے اور اس کے بعد وہ مسلمان ہوگئے تو ان کی املاک کا حکم بھی وہی ہوگیا جو دوسرے مسلمان ہونے والے لوگوں کی املاک کا تھا، اور ان کی زمینیں بھی عشری قرار دی گئیں۔ (صفحہ ۵۱۲)

ب علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ زاد المعاد میں لکھتے ہیں :۔

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ جو شخص اسلام لانے کے وقت جس چیز پر قابض تھا وہ اسی کے قبضہ میں رہنے دی گئی۔ یہ نہیں دیکھا گیا کہ اسلام لانے سے پہلے وہ چیز کس ذریعہ سے اس کے قبضہ میں آئی تھی۔ بلکہ وہ اس کے ہاتھ میں اسی طرح رہنے دی گئی جس طرح وہ پہلے سے چلی آرہی تھی" (جلد ۲ صفحہ ۹۶)

یہ ایک ایسا قاعدہ کلیہ ہے جس میں استثنار کی کوئی ایک مثال بھی عہدِ نبوت اور عہدِ خلافتِ راشدہ کے نظائر میں نہیں ملتی۔ اسلام نے اپنے پیرؤوں کی معاشی زندگی میں جو اصلاحیں بھی جاری کیں آئندہ کے لئے کیں، مگر جو ملکیتیں پہلے سے لوگوں کے قبضے میں چلی آرہی تھیں اُن سے کوئی تعرض نہ کیا۔

قسمِ دوم کا حکم

دوسری قسم ان لوگوں کی تھی جنہوں نے اسلام تو قبول نہ کیا، مگر مصالحانہ طریقہ سے اسلامی حکومت کے تابع بن کر رہنا قبول کرلیا۔ ایسے لوگوں کے بارے میں جو اصول نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمایا وہ یہ تھا کہ جن شرائط پر بھی اُن سے مصالحت ہوئی

ہوا نہیں ہے کم و کاست پورا کیا جائے۔ چنانچہ حدیث میں آپ کا ارشاد ہے:۔

لعلکم تقاتلون قوماً فیظھرون علیکم فیتقون باموالھم دون انفسھم وابناءھم فتصالحونھم علی صلح فلا تصیبوا منھم فوق ذالک فانہ لا یصلح۔ (ابوداؤد۔ ابن ماجہ)

"اگر کبھی ایسا ہو کہ کسی قوم سے تمہاری جنگ ہو، پھر وہ تمہارے سامنے اگر اپنی اور اپنے بال بچوں کی جانیں بچانے کے لئے اپنے مال دینے پر تیار ہو جائیں، اور تم اُن سے صلح کر لو، تو ایسی صورت میں جس چیز پر ان سے تمہاری صلح ہو اُس سے زائد کچھ نہ لینا کیونکہ وہ تمہارے لئے جائز نہیں ہے۔"

الا من ظلم معاھداً او انتقصہ اوکلفہ فوق طاقتہ او اخذ منہ شیئاً بغیر طیب نفس فانا حجیجہ یوم القیامۃ۔ (ابوداؤد)۔

"خبردار رہو، جو شخص کسی معاہد ذمّی پر ظلم کرے گا، یا از روئے معاہدہ اس کے جو حقوق ہوں ان کے اندر کوئی کمی کرے گا، یا اس پر اس کی برداشت سے زیادہ بار ڈالے گا، یا اس سے اس کی رضامندی کے بغیر کوئی چیز لے گا، اس کے خلاف میں خود قیامت کے روز مدعی ہوں گا۔"

اسی اصول کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران، اَیلہ، اَذرُعات، ہجر اور دوسرے جن جن علاقوں اور قبیلوں کے ساتھ صلح کی ان سب کو اُن کی زمینوں اور جائدادوں اور صنعتوں اور تجارتوں پر بدستور بحال رہنے دیا اور صرف وہ جزیہ و خراج اُن سے وصول کرنے پر اکتفا فرمایا جس پر ان سے معاہدہ ہوا تھا۔ پھر اسی

پر خلفائے راشدین نے بھی عمل کیا۔ عراق، شام، الجزیرہ، مصر، ارمینیہ، غرض جہاں جہاں بھی کسی شہر اور کسی بستی کے لوگوں نے صلح کے طریقے پر اپنے آپ کو اسلامی حکومت کے حوالہ کیا ان کی املاک بدستور ان کے قبضے میں رہنے دی گئیں اور اُن سے مالِ صلح کے سوا کوئی چیز کبھی وصول نہ کی گئی۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بعض اہم مصلحتوں کی بنا پر نجران کے باشندوں کو اندرونِ عرب سے شام و عراق کی طرف منتقل کیا بھی گیا تو ان میں سے جس جس کے پاس نجران میں جتنی زرعی اور سکنی جائداد تھی اس کے بدلے میں نہ صرف اُتنی ہی جائداد اُس کو دوسری جگہ دی گئی بلکہ حضرت عمرؓ نے اپنے شام و عراق کے گورنروں کے نام فرمانِ عام لکھا کہ جس کے علاقے میں بھی وہ جا کر آباد ہوں وہ فلیوسعھم من خرایب الارض "وہ فراخ دلی کے ساتھ افتادہ زمینوں میں سے ان کو دے۔" (کتاب الاموال لابی عبید ص ۱۸۹)

اس قاعدہ کلیہ میں بھی کسی استثنار کی مثال عہدِ نبوّت اور عہدِ خلافتِ راشدہ کے نظائر سے پیش نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ یہ بھی فقہاءِ اسلام کا متفق علیہ قانون ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اس کو اپنی کتاب الخراج میں ایک قانونی دفعہ کے طور پر اس طرح ثبت فرماتے ہیں:۔

> "غیر مسلموں میں سے جس قوم کے ساتھ اس بات پر امام کی صلح ہو جائے کہ وہ مطیعِ حکم ہو جائیں اور خراج ادا کریں تو وہ اہلِ ذمہ ہیں، ان کی اراضی اراضیٔ خراج ہیں، اُن سے بس وہی کچھ لیا جائے گا جس پر ان سے صلح ہوئی ہو، اُن کے ساتھ عہد پورا کیا جائے گا اور اُن پر کسی چیز کا اضافہ نہ کیا جائے گا۔" (ص ۳۵)

قسم سوم کے احکام

رہے وہ لوگ جو آخر وقت تک مقابلہ کریں اور بزورِ شمشیر مغلوب ہوں، تو ان کے بارے میں تین مختلف طرزِ عمل ہم کو عہدِ نبوت و خلافتِ راشدہ میں ملتے ہیں:-

ایک وہ طرزِ عمل جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں اختیار فرمایا، یعنی فتح کے بعد لَا تَثْرِیبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ کا اعلانِ عام اور مفتوحین کو جان و مال کی پوری معافی۔ اس صورت میں، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، اہلِ مکہ اپنی زمینوں اور جائدادوں کے بدستور مالک رہے، اور اسلام قبول کرنے کے بعد ان کی زمینیں عشری زمینیں قرار دے دی گئیں۔

دوسرا وہ طرزِ عمل جو آپ نے خیبر میں اختیار فرمایا، یعنی مفتوح علاقے کو مالِ غنیمت قرار دینا۔ اس صورت میں سابق مالکوں کی ملکیت ساقط کر دی گئی، ایک حصہ خدا اور رسول کے حق میں لے لیا گیا، اور باقی زمین کو اُن لوگوں پر تقسیم کر دیا گیا جو فتح خیبر کے موقع پر لشکرِ اسلام میں شامل تھے۔ یہ تقسیم شدہ زمینیں جن جن لوگوں کے حصے میں آئیں وہ ان کے مالک قرار پائے اور اُن پر عشر لگا دیا گیا۔ (کتاب الاموال لابی عبید صہ ۵۱۳)

تیسرا وہ طرزِ عمل جو حضرت عمرؓ نے ابتدائے شام اور عراق میں اختیار فرمایا اور بعد میں تمام مفتوح ممالک کا بندوبست اسی کے مطابق ہوا۔ وہ یہ تھا کہ آپ نے مفتوح علاقے کو فاتح فوج میں تقسیم کرنے کے بجائے اُس کو تمام مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت قرار دیا، اس کا انتظام مسلمانوں کی طرف سے نیابتاً اپنے ہاتھ میں لے لیا، اصل باشندوں کو حسبِ سابق ان کی زمینوں پر بحال رہنے دیا، ان کو ذمی قرار

دے کر ان پر جزیہ و خراج عائد کر دیا، اور اس جزیہ و خراج کا مصرف یہ قرار دیا کہ وہ عام مسلمانوں کی فلاح و بہبود پر صرف ہو، کیونکہ بنیادی نظریہ کے اعتبار سے وہی ان مفتوح علاقوں کے اصل مالک تھے۔

اس آخری صورت میں بظاہر "اجتماعی ملکیت" کے تصور کا ایک دھندلا سا شائبہ پایا جاتا ہے، مگر جس طرح یہ پورا معاملہ طے ہوا تھا اُس کی تفصیلات پر نظر ڈالنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس اجتماعی ملکیت کو اشتراکیت کے تصور سے دُور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ جب مصر و شام اور عراق کے وسیع علاقے فتح ہوئے تو حضرت زبیرؓ اور حضرت بلالؓ اور ان کے ہم خیال لوگوں نے حضرت عمرؓ سے مطالبہ کیا کہ ان علاقوں کی تمام زمینیں اور جائدادیں خیبر کی طرح فاتح فوج میں تقسیم کر دی جائیں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس سے انکار کیا اور حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت مُعاذؓ بن جبل جیسے اکابر صحابہؓ نے اس معاملہ میں اُن کی تائید کی۔ اس انکار کے وجوہ کیا تھے؟ اس پر وہ تقریریں روشنی ڈالتی ہیں جو اس موقع پر ہوئیں۔

حضرت مُعاذؓ نے کہا:۔

> "اگر آپ اسے تقسیم کریں گے تو خدا کی قسم اس کا نتیجہ وہ ہوگا جو آپ ہرگز پسند نہ کریں گے۔ بڑی بڑی زرخیز زمینوں کے ٹکڑے فوج میں تقسیم ہو جائیں گے۔ پھر یہ لوگ مر کھپ جائیں گے اور کسی کی وارث کوئی عورت ہوگی اور کسی کا وارث کوئی بچہ ہوگا۔ پھر جو دوسرے لوگ اسلام کی سرحدوں کی حفاظت کے لئے اٹھیں گے انہیں دینے کے لئے حکومت کے پاس کچھ نہ ہوگا۔ لہٰذا آپ وہ کام کیجئے جس میں آج کے

لوگوں کے لئے بھی گنجائش ہو اور بعد والوں کے لئے بھی۔"

حضرت علیؓ نے فرمایا:۔

"ملک کی کاشت کار آبادی کو اس کے حال پر رہنے دیجئے تاکہ وہ سب مسلمانوں کے لئے معاشی قوت کا ذریعہ ہوں۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں زمین کو تم لوگوں پر تقسیم کر دوں اور بعد کے آنے والوں کو اس حال میں چھوڑ دوں کہ ان کا اس میں کچھ حصہ نہ ہو ..... آخر بعد کی نسلوں کے لئے کیا رہے گا؟ ..... کیا تم لوگ چاہتے ہو کہ آئندہ آنے والوں کے لئے کچھ نہ رہے؟ ..... اور مجھے یہ بھی اندیشہ ہے کہ اگر میں اسے تمہارے درمیان تقسیم کر دوں تو تم پانی پر آپس میں فساد کرنے لگو گے۔"

اس بنیاد پر جو فیصلہ کیا گیا وہ یہ تھا کہ زمین اس کے سابق باشندوں ہی کے پاس رہنے دی جائے، اور ان کو ذمی بنا کر ان پر جزیہ و خراج لگا دیا جائے، اور یہ خراج مسلمانوں کی عام فلاح پر صرف ہو۔ اس فیصلہ کی اطلاع حضرت عمرؓ نے اپنے عراق کے گورنر، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو جن الفاظ میں دی تھی وہ یہ ہیں:۔

فانظر ما اجلبوا به علیك فی العسكر من كراع او مال فاقسمه بين من حضر من المسلمين واترك الارضين والانهار لعمالها ليكون ذالك فی اعطيات المسلمين، فانا لو قسمناها بين

من حضر لم یکن لمن بعدھم شیٔ[1]۔

"جو کچھ اموال منقولہ سپاہیوں نے دورانِ جنگ میں بطورِ غنیمت حاصل کیے ہیں اور لشکر میں جمع کرا دیے ہیں انہیں تو انہی لوگوں میں تقسیم کر دو جو جنگ میں شریک ہوئے تھے۔ مگر نہروں اور زمینوں کو انہی لوگوں کے ہاتھوں میں رہنے دو جو ان پر کام کرتے تھے تاکہ وہ مسلمانوں کی تنخواہوں کے لئے محفوظ رہیں۔ ورنہ اگر ہم ان کو بھی موجودہ لوگوں میں تقسیم کر دیں تو پھر بعد والوں کے لئے کچھ نہ رہے گا۔"

اس نئے بندوبست کا اساسی نظریہ تو یہی تھا کہ اب ان مفتوحہ اراضی کے مالک مسلمان ہیں، اور سابق مالکوں کی اصل حیثیت صرف کاشتکار کی ہے، اور حکومت مسلمانوں کے ایجنٹ کی حیثیت سے ان کے ساتھ معاملہ کر رہی ہے[2]، لیکن عملاً ذمّی

---

[1] اس پوری بحث کے لئے ملاحظہ ہو کتاب الخراج صفحہ ۲۲-۲۷۔ اور کتاب الاموال صفحہ ۵۷-۶۳)

[2] اس نظریہ کی توضیح اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ عُتبہ بن فرقد حضرت عمرؓ سے ملنے آئے اور اُن کو اطلاع دی کہ میں نے فرات کے کنارے زمین کا ایک ٹکڑا خریدا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کس سے؟ انہوں نے عرض کیا اُس کے مالکوں سے۔ آپ نے مہاجرین و انصار کی طرف اشارہ کر کے فرمایا اس کے مالک تو یہاں بیٹھے ہیں (کتاب الاموال صفحہ ۷۶) اور حضرت علیؓ کا وہ ارشاد بھی اس نظریہ پر روشنی ڈالتا ہے کہ جب عراق کے پرانے زمینداروں میں سے ایک نے آکر آپ کے سامنے قبولِ اسلام کا اعلان کیا تو آپ نے فرمایا کہ اب جزیہ تو تجھ سے ساقط ہو گیا لیکن تیری زمین خراجی ہی رہے گی، کیونکہ وہ ہماری ہے۔ (کتاب الاموال صفحہ ۸۰)

بنا لینے کے بعد اُن کو جو حقوق دیئے گئے وہ مالکانہ حقوق سے کچھ بھی مختلف نہ تھے۔ وہ انہی رقبوں پر قابض رہے جن پر پہلے قابض تھے۔ ان پر خراج کے سوا کوئی دوسری چیز حکومت یا مسلمانوں کی طرف سے عائد نہ کی گئی۔ اور ان کو اپنی زمینوں پر بیع اور رہن اور وراثت کے وہ تمام حقوق بدستور حاصل رہے جو پہلے حاصل تھے۔ اس معاملہ کو امام ابو یوسفؒ ایک قانونی ضابطہ کی شکل میں یوں بیان فرماتے ہیں:-

"جس سرزمین کو امام بزور شمشیر فتح کرے اس کے معاملہ میں وہ اختیار رکھتا ہے کہ اگر چاہے تو فاتح فوج میں اسے تقسیم کر دے۔ اس صورت میں وہ عُشری زمین ہو جائے گی۔ لیکن اگر وہ تقسیم کرنا مناسب سمجھے اور بہتر یہی خیال کرے کہ اسے اس کے پُرانے باشندوں کے ہاتھوں میں رہنے دے، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے عراق میں کیا، تو وہ ایسا کرنے کا اختیار بھی رکھتا ہے۔ اس صورت میں وہ زمین خراجی ہوگی اور خراج لگ جانے کے بعد پھر امام کو یہ حق باقی نہ رہے گا کہ اس کے باشندوں سے اس کو چھین لے۔ وہ ان کی ملک ہوگی، وہ اس کو وراثت میں ایک دوسرے کی طرف منتقل کریں گے، اس کی خرید و فروخت کر سکیں گے، ان پر خراج لگا دیا جائے گا، اور ان کی طاقت سے زیادہ ان پر بوجھ نہ ڈالا جائے گا" (کتاب الخراج۔ صفحہ ۳۵-۳۶)

قسم چہارم کے احکام

مذکورۂ بالا تین قسمیں تو اُن اراضی کی تھیں جو پہلے سے مختلف قسم کے لوگوں کی ملکیت میں تھیں اور اسلامی نظام قائم ہونے کے بعد یا تو ان کی پچھلی ملکیتوں ہی کی توثیق

کر دی گئی، یا بعض حالات میں اگر ردّ و بدل کیا بھی گیا تو صرف ہاتھوں میں کیا گیا نہ کہ بجائے خود نظامِ ملکیت میں۔ اس کے بعد ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جن زمینوں کا کوئی مالک نہ تھا، یا نہ رہا تھا، ان کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء نے کیا طرزِ عمل اختیار فرمایا۔

اس نوعیت کی اراضی دو بڑی اصناف پر مشتمل تھیں:۔

ایک "مَوَات" یعنی افتادہ زمینیں، خواہ وہ عادیُّ الارض ہوں (جن کے مالک مر کھپ گئے ہوں) یا جن کا کبھی کوئی مالک رہا ہی نہ ہو، یا جو جھاڑیوں اور دلدلوں اور سیلابوں کے نیچے آگئی ہوں۔

دوسری "خالصہ" زمینیں، یعنی جن کو سرکاری املاک قرار دیا گیا تھا۔ ان میں کئی طرح کی اراضی شامل تھیں۔ ایک وہ جن کے مالکوں نے خود ان سے دست بردار ہو کر حکومت کو اختیار دے دیا تھا کہ انہیں جس طرح چاہے استعمال کرے[1]۔ دوسری وہ جن کے مالکوں کو اسلامی حکومت نے بے دخل کر کے خالصہ کر لیا تھا۔ مثلاً مضافاتِ مدینہ میں بنی نَضِیر کی زمینیں۔ تیسری وہ جو مفتوحہ علاقوں میں خالصہ قرار دی گئی تھیں۔ مثلاً وہ اراضی جو عراق میں کسریٰ اور اس کے اہلِ خاندان کے قبضہ میں تھیں، یا جن کے مالک جنگ میں مارے گئے تھے یا بھاگ گئے تھے،

---

[1] ابنِ عباس کی روایت ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو انصار نے وہ تمام زمینیں جن تک ان کی آبپاشی کا پانی نہ پہنچتا تھا، آپ کے حوالہ کر دیں تاکہ آپ اُن سے جو چاہیں کام لیں۔ (کتاب الاموال صفحہ ۲۸۲)

اور حضرت عمرؓ نے ان کو خالصہ قرار دے دیا تھا[1]۔

ان دونوں اقسام کا حکم ہم الگ الگ بیان کریں گے۔

حقوق ملکیت بربنائے آباد کاری

"مَوَات" کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قدیم ترین اصول کی تجدید فرمائی جس سے دنیا میں ملکیت زمین کا آغاز ہوا ہے۔ جب انسان نے اس کرۂ خاکی کو آباد کرنا شروع کیا تو اصول یہی تھا کہ جو جہاں رہ پڑا ہے وہ جگہ اسی کی ہے، اور جس جگہ کو کسی نے کسی طور پر کار آمد بنالیا ہے اُس کے استعمال کا وہی زیادہ حقدار ہے۔ یہی قاعدہ تمام عطیاتِ فطرت پر انسان کے مالکانہ حقوق کی بنیاد ہے، اور اسی کی توثیق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر اپنے ارشادات میں فرمائی ہے۔ چنانچہ احادیث میں آتا ہے:-

عن عائشۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من عمر ارضا لیست لاحد فھو احق بھا۔ قال عروۃ قضٰی بہ عمر فی خلافتہٖ۔

(بخاری - احمد - نسائی)

"حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی ایسی زمین کو آباد کیا جو کسی دوسرے کی ملک نہ ہو وہی اس کا زیادہ حقدار ہے۔ عُروہ بن زُبیر کہتے ہیں کہ اسی پر حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں

---

[1] اس طرح کی اراضی کی دس اقسام امام ابو یوسف اور ابو عبید رحمہما اللہ نے اپنی کتابوں میں گنائی ہیں۔

عملدر آمد کیا۔"

عن جابر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من احییٰ ارضاً میتۃ فھی لہٗ۔ (احمد، ترمذی، نسائی، ابن حبان)

"جابر بن عبداللہ کی روایت ہے کہ جس کسی نے مردہ زمین کو زندہ کیا (یعنی بے کار پڑی ہوئی زمین کو کارآمد بنا لیا) وہ زمین اسی کی ہے۔"

عن سمرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من احاط حائطاً علی ارض فھی لہٗ۔ (ابوداؤد)

"سمرہ بن جُندُب سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے کسی افتادہ زمین پر احاطہ کھینچ لیا وہ اُسی کی ہے۔"

عن اسمر بن مضرس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من سبق الی ماء لم یسبقہ الیہ مسلم فھو لہٗ۔ (ابوداؤد)

"اسمر بن مُضَرِّس سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص کسی ایسے کنوئیں کو پائے جس پر پہلے کوئی مسلمان قابض نہ ہو وہ کنواں اسی کا ہے۔"

عن عروۃ قال اشھد ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قضیٰ ان الارض ارض اللہ والعباد عباد اللہ، ومن احییٰ مواتاً فھو احق بھا، جاءنا بھذا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم الذین جاؤا بالصلوات عنہ۔ (ابوداؤد)

"عُروہ بن زبیر (تابعی) کہتے ہیں کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے یہ فیصلہ فرمایا تھا کہ زمین خدا کی ہے اور بندے بھی خدا کے ہیں، جو شخص کسی مردہ زمین کو زندہ کرے وہی اس زمین کا زیادہ حقدار ہے۔ یہ قانون ہم تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے انہی بزرگوں کے ذریعہ پہنچا ہے جن کے ذریعہ سے پنجوقتہ نماز پہنچی ہے۔ (یعنی صحابۂ کرام)

اس فطری اصول کی تجدید و توثیق کرنے کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے دو ضابطے مقرر فرما دیئے۔ ایک یہ کہ جو شخص دوسرے کی مملوکہ زمین کو آباد کرے وہ اس فعل آبادکاری کی بنا پر ملکیت کا حقدار نہ ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ جو شخص خواہ مخواہ احاطہ کھینچ کر یا نشان لگا کر کسی زمین کو روک رکھے اور اس پر کوئی کام نہ کرے اس کا حق تین سال کے بعد ساقط ہو جائے گا۔ پہلے ضابطہ کو آپ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:۔

عن سعید بن زید قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من احییٰ ارضاً میتۃً فھی لہ ولیس لعرقٍ ظالمٍ حقٌ۔ (احمد، ابوداؤد، ترمذی)

"سعید بن زید کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کسی نے کسی مردہ زمین کو زندہ کر لیا وہ اسی کی ہے، اور دوسرے کی زمین میں ناروا طور پر آبادکاری کرنے والے کے لئے کوئی حق نہیں ہے۔

دوسرے ضابطہ کا ماخذ یہ روایات ہیں:۔

عن طاؤس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عادیّ الارض للہ وللرسول ثم لکم من بعد فمن احییٰ ارضاً

میتۃ فھی لہ ولیس لمحتجر حق بعد ثلث سنین۔

(ابو یوسف، کتاب الخراج)

"طاؤس (تابعی) کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا غیر مملوکہ زمین جس کا کوئی ولی و وارث نہ ہو خدا اور رسول کی ہے، پھر اس کے بعد وہ تمہارے لئے ہے۔ پس جو کوئی کسی مردہ زمین کو زندہ کرلے وہ اسی کی ہے۔ اور بے کار روک کر رکھنے والے کے لئے تین سال کے بعد کوئی حق نہیں ہے۔"

عن سالم بن عبد اللہ ان عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قال علی المنبر من احیی ارضا میتۃ فھی لہ ولیس لمحتجر حق بعد ثلث سنین وذالک ان رجالا کانوا یحتجرون من الارض مالا یعملون۔ (ابو یوسف۔ کتاب الخراج)

"سالم بن عبد اللہ (حضرت عمر رضی اللہ کے پوتے) روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بر سر منبر فرمایا کہ جس نے کسی مردہ زمین کو زندہ کیا وہ اسی کی ہے مگر خواہ مخواہ روک رکھنے والے کے لئے تین سال کے بعد کوئی حق نہیں ہے۔ یہ اعلان کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی تھی کہ بعض لوگ زمینوں کو یونہی روک رکھتے تھے اور ان پر کوئی کام نہ کرتے تھے"

یہ مسئلہ فقہاء اسلام کے درمیان متفق علیہ ہے۔ اگر کوئی اختلاف ہے تو صرف اس امر میں کہ آیا محض آبادکاری کا فعل ہی سے کوئی شخص ارض موات کا مالک ہو جاتا ہے یا ثبوت ملکیت کے لئے حکومت کی منظوری و اجازت ضروری

ہے۔ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ اس کے لئے حکومت کی منظوری کو ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ بن حنبل کی رائے یہ ہے کہ اس معاملہ میں احادیث بالکل صاف ہیں، لہٰذا آباد کار کا حقِ ملکیت حکومت کی اجازت اور منظوری پر موقوف نہیں ہے، وہ خدا اور رسول کے دئیے ہوئے حق کی بنا پر مالک ہو جائیگا، اس کے بعد حکومت کا کام یہ ہے کہ جب معاملہ اس کے سامنے آئے تو وہ اس حق کو تسلیم کرے اور نزاع کی صورت میں اس کا استقرار کرلئے۔ امام مالکؒ بستی سے قریب کی زمینوں اور دور دراز کی افتادہ اراضی میں فرق کرتے ہیں پہلی قسم کی زمینیں ان کے نزدیک اس حکم سے مستثنٰی ہیں۔ رہیں دوسری قسم کی زمینیں تو ان کے لئے امام کے عطیہ کی شرط نہیں۔ وہ محض احیاء سے آدمی کی ملک ہو جاتی ہیں۔

اس معاملہ میں حضرت عمرؓ اور حضرت عمرؓ بن عبدالعزیزؒ، دونوں کا طرزِ عمل یہ تھا کہ اگر کوئی شخص کسی زمین کو افتادہ سمجھ کر آباد کر لیتا، اور بعد میں کوئی دوسرا شخص آکر ثابت کرتا کہ زمین اُس کی تھی، تو اُس کو اختیار دیا جاتا تھا کہ یا تو آباد کار کے عمل کا معاوضہ ادا کر کے اپنی زمین لے لے، یا زمین کی قیمت لے کر حقِ ملکیت اس کی طرف منتقل کر دے[1]۔

عطیۂ زمین من جانبِ سرکار

پھر "موات" اور "خالصہ" دونوں طرح کی زمینوں میں سے بکثرت قطعات نبی

---

[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو کتاب الخراج لابی یوسف صفحہ ۳۶-۳۷، و کتاب الاموال لابی عبید صفحہ ۲۸۵-۲۸۹۔ شیخ علی متقی نے کنز العمال میں اس مسئلے پر تمام احادیث و آثار کو یکجا جمع کر دیا ہے۔ جو اصحاب اس کی پوری تفصیلات دیکھنا چاہیں وہ کتاب مذکور کے جزء دوم میں احیاءِ موات کی بحث ملاحظہ فرمائیں۔

صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی لوگوں کو عطا فرمائے، اور آپ کے بعد خلفائے راشدینؓ بھی برابر اس طرح کے عطیے دیتے رہے۔ اس کی بہت سی نظیریں حدیث و آثار کے ذخیرے میں موجود ہیں جن میں سے چند یہاں نقل کی جاتی ہیں:۔

(۱) عُروہ بن زبیرؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو اور حضرت عمرؓ بن خطاب کو چند زمینیں عطا کی تھیں۔ پھر حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں حضرت زبیرؓ نے خاندانِ عمرؓ کے لوگوں سے ان کے حصّے کی زمین خرید لی اور اس خریداری کی توثیق کے لئے حضرت عثمانؓ کے پاس حاضر ہوئے اور ان سے کہا کہ عبدالرحمٰنؓ بن عوف کی شہادت یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ زمینیں اُن کو اور عمرؓ بن خطاب کو عطا کی تھیں، سو میں نے خاندانِ عمرؓ سے ان کا حصّہ خرید لیا ہے۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے کہا کہ عبدالرحمٰن سچی شہادت دینے والے آدمی ہیں خواہ وہ اُن کے حق میں پڑتی ہو یا ان کے خلاف۔ (مسند امام احمدؒ)

(۲) علقمہ بن وائل اپنے والد (وائل بن حُجر) سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حضر موت میں ایک زمین عطا کی تھی۔ (ابو داؤد۔ ترمذی)

(۳) حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی حضرت اسماءؓ بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے شوہر حضرت زبیرؓ کو خیبر میں ایک زمین عطا فرمائی تھی جس میں کھجور کے درخت بھی تھے اور دوسرے درخت بھی۔ اس کے علاوہ عُروہ بن زبیر کا بیان ہے کہ آپؐ نے اُن کو ایک نخلستان بنی نضیر کی زمینوں میں سے بھی دیا تھا۔ نیز عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک اور وسیع خطۂ زمین بھی آپؐ نے حضرت زبیرؓ کو دیا تھا۔ اور اس کی صورت یہ تھی کہ آپؐ نے اُن سے فرمایا گھوڑا دوڑاؤ، جہاں جا کر تمہارا گھوڑا ٹھیر

جائے گا وہاں تک کی زمین تمہیں دے دی جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے گھوڑا دوڑایا اور جب ایک جگہ جاکر گھوڑا ٹھیر گیا تو وہاں سے انہوں نے اپنا کوڑا آگے پھینک دیا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا، اچھا، جہاں ان کا کوڑا گرا ہے وہاں تک کی زمین انہیں دے دی جائے۔ (بخاری، احمد، ابو داؤد، کتاب الخراج لابی یوسف، کتاب الاموال لابی عبید)

(۴) عَمرو بن دینار کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں کو زمینیں عطا فرمائیں۔ (کتاب الخراج لابی یوسف)

(۵) ابو رافع بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خاندان والوں کو ایک زمین عطا کی تھی مگر وہ اسے آباد نہ کر سکے اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں انہوں نے اسے ۸ ہزار دینار میں فروخت کر دیا۔ (کتاب الخراج)

(۶) ابن سیرین کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار میں سے ایک صاحب سُلیط کو ایک زمین عطا فرمائی۔ وہ اس کے انتظام کے لئے اکثر باہر جاتے رہتے اور بعد میں آکر انہیں معلوم ہوتا کہ اُن کے پیچھے اتنا اتنا قرآن نازل ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ یہ احکام دیئے۔ اس سے ان کی بڑی دل شکنی ہوتی۔ آخرکار انہوں نے ایک روز آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یہ زمین میرے اور آپ کے درمیان حائل ہوگئی ہے، آپ اُسے مجھ سے واپس لے لیں۔ چنانچہ وہ واپس لے لی گئی۔ بعد میں حضرت زبیرؓ نے اس کے لئے درخواست کی اور آپ نے وہ زمین اُن کو دے دی۔ (کتاب الاموال)

(۷) بلالؓ بن حارث مُزنی کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو عقیق کی

پوری زمین عطا فرمائی تھی۔ (کتاب الاموال)

(۸) عدی رضؓ بن حاتم کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرات بن حیان عجلی کو یمامہ میں ایک زمین عطا کی تھی۔ (کتاب الاموال)

(۹) عرب کے مشہور طبیب حارث بن کلدہ کے بیٹے نافع نے حضرت عمرؓ سے درخواست کی کہ بصرہ کے علاقے میں ایک زمین ہے جو نہ تو اراضی خراج میں شامل ہے اور نہ مسلمانوں میں سے کسی کا مفاد اس سے وابستہ ہے۔ آپ وہ مجھے عطا کر دیں، میں اپنے گھوڑوں کے لئے اس میں چارہ کی کاشت کروں گا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے گورنر ابو موسیٰ اشعری کو فرمان لکھا کہ اگر اس زمین کی کیفیت وہی ہے جو نافع نے مجھ سے بیان کی ہے تو وہ ان کو دے دی جائے۔ (کتاب الاموال)

(۱۰) موسیٰ بن طلحہؓ کی روایت ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں زبیرؓ بن عوام، سعدؓ بن ابی وقاص، عبداللہ بن مسعودؓ، اسامہؓ بن زید، خبابؓ بن ارت، عمارؓ بن یاسر اور سعدؓ بن مالک رضی اللہ عنہم کو زمینیں عطا کی تھیں۔ (کتاب الخراج کتاب الاموال)

(۱۱) عبداللہ بن حسنؓ کی روایت ہے کہ حضرت علیؓ کی درخواست پر حضرت عمرؓ نے اُن کو یَنبُع کا علاقہ عطا کیا تھا۔ (کنز العمال)

(۱۲) امام ابو یوسف متعدد معتبر حوالوں سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اُن سب زمینوں کو خالصہ قرار دیا تھا جو کسریٰ اور آلِ کسریٰ نے چھوڑی تھیں، یا جن کے مالک بھاگ گئے تھے، یا جنگ میں مارے گئے تھے، یا جو دلدل اور سیلاب اور جھاڑیوں کے نیچے آگئی تھیں۔ پھر جن لوگوں کو بھی آپ زمینیں عطا کرتے

تھے انہی اراضی میں سے کرتے تھے۔ (کتاب الخراج)

عطیۂ زمین کے بارے میں شرعی ضابطہ

یہ عطائے زمین کا طریقہ محض شاہانہ بخشش وانعام کی نوعیت نہ رکھتا تھا بلکہ اس کے چند قواعد تھے جو ہم کو احادیث و آثار میں ملتے ہیں۔

۱۔ پہلا قاعدہ یہ تھا کہ جو شخص زمین لے کر اس پر کچھ کام نہ کرے اس کا عطیہ منسوخ سمجھا جائے گا۔ اس کی نظیر میں امام ابو یوسف یہ روایت لاتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ مُزینہ اور جُہینہ کے لوگوں کو کچھ زمین دی تھی۔ مگر انہوں نے وہ بیکار رکھ چھوڑی۔ پھر کچھ اور لوگ آئے اور انہوں نے اسے آباد کر لیا۔ اس پر مُزینہ اور جُہینہ کے لوگ حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں دعویٰ لے کر آئے حضرت عمرؓ نے جواب دیا اگر یہ میرا یا ابوبکرؓ کا عطیہ ہوتا تو میں اسے منسوخ کر دیتا۔ لیکن یہ عطیہ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، اس لئے میں مجبور ہوں۔ البتہ قانون یہی ہے کہ

من کانت لہ ارض ثم ترکھا ثلث سنین فلم یعمرھا فعمرھا قوم اٰخرون فھم احق بھا۔

"جس کے پاس ایک زمین ہو اور وہ اس کو تین برس تک بیکار ڈال رکھے اور آباد نہ کرے، پھر کچھ دوسرے لوگ آ کر اسے آباد کر لیں تو وہی اُس زمین کے زیادہ حقدار ہیں"

۲۔ دوسرا قاعدہ یہ تھا کہ جو عطیہ صحیح طور پر استعمال میں نہ آ رہا ہو اس پر نظر ثانی کی جا سکتی ہے۔ اس کی نظیر میں ابو عبید نے کتاب الاموال میں اور یحییٰ بن آدم نے الخراج میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن حارثؓ مُزنی کو پوری

وادیٔ عقیق دے دی تھی۔ مگر وہ اس کے بڑے حصے کو آباد نہ کر سکے۔ یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں ان سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ زمین تم کو اس لئے نہیں دی تھی کہ تم نہ خود اس کو استعمال کرو اور نہ دوسروں کو استعمال کرنے دو۔ اب تم اس میں سے بس اتنی رکھ لو جسے استعمال کر سکو۔ باقی ہمیں واپس کرو تاکہ ہم اس کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیں۔ بلال بن حارثؓ نے اس سے انکار کیا۔ حضرت عمرؓ نے پھر اصرار کیا۔ آخر کار جتنا رقبہ ان کے زیر استعمال تھا اسے چھوڑ کر باقی پوری زمین آپ نے ان سے واپس لے لی اور دوسرے مسلمانوں میں اس کے قطعات بانٹ دیئے۔

۳۔ تیسرا قاعدہ یہ تھا کہ حکومت صرف اراضی موات اور اراضی خالصہ ہی میں سے زمینیں عطا کرنے کی مجاز ہے۔ یہ حق اس کو نہیں ہے کہ ایک شخص کی زمین چھین کر دوسرے کو دیدے۔ یا اصل مالکان اراضی کے سر پر خواہ مخواہ ایک شخص کو جاگیردار یا زمیندار بنا کر مسلط کر دے اور اس کو مالکانہ حقوق عطا کر کے اصل مالکوں کی حیثیت اس کے ماتحت کاشتکاروں کی سی بنا دے۔

۴۔ چوتھا قاعدہ یہ تھا کہ حکومت زمینیں انہی لوگوں کو دے گی جنہوں نے فی الحقیقت اجتماعی مفاد کے لئے کوئی قابلِ قدر خدمت انجام دی ہو، یا جن سے اب اس نوعیت کی کوئی خدمت متعلق ہو، یا جن کو عطیہ دینا کسی نہ کسی طور پر اجتماعی مفاد کے لئے مناسب ہو۔ رہیں شاہانہ غلط بخشیاں جن سے ڈوم ڈھاڑیوں اور خوشامدی لوگوں کو نوازا گیا ہو، یا وہ عطیے جو ظالموں اور جباروں نے اجتماعی مفاد کے برعکس خدمات انجام دینے والوں کو دیئے ہوں، تو وہ کسی طرح جائز عطایا کی

تعریف میں نہیں آتے۔

جاگیروں کے معاملہ میں صحیح شرعی رویہ

موخر الذکر دونوں اصولوں کی بنیاد اُس پورے طرزِ عمل پر قائم ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء نے برتا تھا۔ اس کی تشریح امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب الخراج میں اس طرح فرماتے ہیں:۔

"امام عادل کو حق ہے کہ جو مال کسی کی ملک نہ ہو اور جس کا کوئی وارث بھی نہ ہو اُس میں سے ان لوگوں کو عطیے اور انعام دے جن کی اسلام میں خدمات ہوں . . . . جس شخص کو وُلاۃ مہدیین (راہ راست پر چلنے والے فرمانرواؤں) نے کوئی زمین عطا کی ہو اُسے واپس لینے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ لیکن جو زمین کسی حاکم نے ایک سے چھینی اور دوسرے کو بخشی تو اس کی حیثیت اس مال کی سی ہے جو ایک سے غصب کیا گیا اور دوسرے کو عطا کر دیا گیا"

کچھ دُور آگے چل کر پھر لکھتے ہیں:۔

"پس جن جن اقسام کی زمینوں کا ہم نے ذکر کیا ہے کہ امام ان کو عطا کر سکتا ہے۔ اُن میں سے جو زمین بھی عراق اور عرب اور الجبال اور دوسرے علاقوں میں "وُلاۃِ مہدیین" نے کسی کو دی ہے، بعد کے خلفاء کے لئے حلال نہیں ہے کہ اسے واپس لیں یا اُن لوگوں کے قبضے سے نکالیں جن کے پاس ایسی زمینیں اِس وقت موجود ہیں، خواہ وہ اُنہوں نے وراثت میں پائی ہوں یا وارثوں سے خریدی ہوں"

آخر میں اس بحث کو ختم کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

"پس یہ نظیریں ثابت کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی زمینیں عطا کی ہیں اور آپ کے بعد خلفا بھی دیتے رہے ہیں۔ آنحضرتؐ نے جس کو بھی زمین دی یہ دیکھ کر دی کہ ایسا کرنے میں صلاح اور بہتری ہے، مثلاً کسی نومسلم کی تالیفِ قلب، یا زمین کی آبادی۔ اسی طرح خلفاءِ راشدین نے بھی جس کو زمین دی یہ دیکھ کر دی کہ اس نے اسلام میں کوئی عمدہ خدمت انجام دی ہے، یا وہ اعدائے اسلام کے مقابلہ میں کار آمد ہو سکتا ہے، یا یہ کہ ایسا کرنے میں بہتری ہے" (کتاب الخراج ص ۳۲-۳۵)

یہ تصریحات امام ابو یوسفؒ نے دراصل عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے اس سوال کے جواب میں فرمائی ہیں کہ جاگیروں کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور ایک فرمانروا کہاں تک جاگیریں عطا اور ضبط کرنے کا مجاز ہے؟ اس کا جو کچھ جواب امام صاحب نے دیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے عطائے زمین بجائے خود تو ایک جائز فعل ہے، مگر نہ سب زمین دینے والے یکساں ہیں اور نہ سب لینے والے۔ ایک عطیہ وہ ہے جو عادل، متدین، راست رو اور خدا ترس حکمرانوں نے دیا ہو۔ اعتدال کے ساتھ دیا ہو۔ دین اور ملت کے سچے خادموں کو، یا کم از کم مفید اور کار آمد لوگوں کو دیا ہو۔ کسی ایسی غرض کے لئے دیا ہو جس کا فائدہ بحیثیت مجموعی ملک اور ملت ہی کی طرف پلٹتا ہو۔ اور ایسے مال میں سے دیا ہو جس کے دینے کے وہ مجاز تھے۔ دوسرا عطیہ وہ ہے جو ظالموں اور جباروں اور نفس پرستوں نے دیا ہو۔ برے لوگوں کو دیا ہو۔ بری اغراض کے لئے دیا ہو۔ بے تحاشا

دیا ہو۔ اور ایسے مال میں سے دیا ہو جس کے دینے کا اُن کو حق نہ تھا۔ یہ دو مختلف طرح کے عطیے ہیں اور دونوں کا حکم یکساں نہیں ہے۔ پہلا عطیہ جائز ہے اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو برقرار رکھا جائے۔ دوسرا عطیہ ناجائز ہے اور انصاف چاہتا ہے کہ اسے منسوخ کیا جائے۔ بڑا ظالم ہے وہ جو دونوں طرح کے عطیوں کو ایک ہی لکڑی سے ہانک دے۔

حقوقِ ملکیت کا احترام

یہ شواہد و نظائر اُس پورے دور کے عملدرآمد کا نقشہ پیش کرتے ہیں جس میں قرآن کے منشا کی تفسیر خود قرآن کے لانے والے نے اور اس کے براہِ راست شاگردوں نے اپنے اقوال اور اعمال میں کی تھی۔ اس نقشے کو دیکھنے کے بعد کسی شخص کے لئے اس طرح کا کوئی شبہ تک کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ زمین کے معاملہ میں اسلام کے پیشِ نظر یہ اصول تھا کہ اُسے شخصی ملکیتوں سے نکال کر اجتماعی ملکیت بنا دیا جائے۔ اس کے بالکل برعکس اس نقشے سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ اسلام کی نگاہ میں زمین سے انتفاع کی فطری اور صحیح صورت صرف یہی ہے کہ وہ افراد کی ملکیت ہو۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے محض اتنا ہی نہیں کیا کہ اکثر و بیشتر حالات میں سابق ملکیتوں ہی کو برقرار رکھا، بلکہ جن صورتوں میں آپ نے پچھلی ملکیتیں منسوخ کیں اُن میں بھی نئی انفرادی ملکیتیں پیدا کر دیں، اور آئندہ کے لئے غیر مملوکہ اراضی پر نئی ملکیتوں کے قیام کا دروازہ کھول دیا، اور خود سرکاری املاک کو بھی افراد میں تقسیم کر کے انہیں حقوقِ ملکیت عطا فرمائے۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ سابق نظامِ ملکیت کو محض ایک ناگزیر برائی کے طور پر تسلیم نہیں

کیا گیا تھا بلکہ ایک اصولِ برحق کی حیثیت سے اس کو باقی رکھا گیا اور آیندہ کے لئے اسی کو جاری کیا گیا۔

اس کا مزید ثبوت وہ احکام ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حقوقِ ملکیت کے احترام کے متعلق دیئے ہیں۔ مسلم نے متعدد حوالوں سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ کے بہنوئی سعید بن زید رضی اللہ عنہ پر ایک عورت نے مروان بن حکم کے زمانہ میں دعویٰ دائر کیا کہ انہوں نے میری زمین کا ایک حصہ ہضم کر لیا ہے۔ اس کے جواب میں حضرت سعیدؓ نے مروان کی عدالت میں جو بیان دیا وہ یہ تھا کہ میں اس کی زمین کیسے چھین سکتا تھا جبکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ سنے ہیں کہ :-

مَن اخذ شبرًا من الارض ظلمًا طُوِّقَهٗ الی سبع ارضین۔

"جس شخص نے بالشت بھر زمین بھی از راہِ ظلم لی اس کی گردن میں سات تہوں تک اُسی زمین کو طوق بنا کر ڈال دیا جائے گا"

اسی مضمون کی احادیث مسلم نے حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ سے بھی نقل کی ہیں۔ (مسلم۔ کتاب المساقات والمزارعہ۔ باب تحریم الظلم وغصب الارض)

ابو داؤد، نسائی اور ترمذی نے متعدد حوالوں سے یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

لیس لعِرقٍ ظالمٍ حقٌّ۔

"دوسرے کی زمین میں بلا استحقاق آباد کاری کرنے والے کے لئے کوئی حق نہیں ہے"

رافع ؓ بن خدیج کی روایت ہے کہ حضور ؐ نے فرمایا:۔

من زرع فی ارض قوم بغیر اذنہم فلیس لہٗ من الزرع شیٌ ولہٗ نفقتہٗ۔

"جس نے دوسرے لوگوں کی زمین میں ان کی اجازت کے بغیر کاشت کی وہ اس کھیتی پر تو کوئی حق نہیں رکھتا، البتہ اس کا خرچ اُسے دلوا دیا جائے گا۔"

(ابوداؤد، ابن ماجہ، ترمذی)

عُروہ بن زبیر ؓ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک مقدمہ آیا جس میں ایک شخص نے ایک انصاری کی زمین میں کھجور کے درخت لگا دیئے تھے۔ اس پر آنحضرت ؐ نے فیصلہ دیا کہ وہ درخت اکھاڑ کر پھینک دیئے جائیں اور زمین اصل مالک کے حوالہ کی جائے (ابوداؤد)

یہ احکام کس چیز کی شہادت دیتے ہیں؟ کیا اس بات کی کہ زمین کی شخصی ملکیت کوئی برائی تھی جسے مٹانا مطلوب تھا مگر ناگزیر سمجھ کر مجبوراً برداشت کیا گیا؟ یا اس بات کی کہ یہ سراسر ایک جائز و معقول حق تھا جس کا احترام افراد اور حکومت دونوں پر فرض کر دیا گیا؟

مزارعت کا مسئلہ

اب ہمیں اُن احادیث کی تحقیق کرنی چاہیئے جن سے یہ گمان ہوتا ہے کہ شریعت زمین کی شخصی ملکیت کو صرف خود کاشتی کی حد تک محدود کر دینا چاہتی ہے اور اسی غرض کے لئے اس نے بٹائی اور نقد لگان کی ممانعت کی ہے۔ اس مسئلے کی پوری تحقیق کے لئے پہلے ہم اُن احادیث کو بتمام و کمال نقل کریں گے جن پر اس گمان کی بنا قائم ہے، پھر ان پر تنقید کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ اس معاملہ میں اصل احکام شریعت کیا ہیں۔

احادیث کا تتبع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جن روایات میں مزارعت یا کرایۂ زمین کی ممانعت وارد ہوئی ہے، یا جن میں یہ حکم آیا ہے کہ آدمی کے پاس خود کاشت سے زائد جتنی زمین ہو اُسے دوسروں کو مفت دیدے یا روک رکھے، وہ ۶ صحابیوں سے مروی ہیں: رافع رضؓ بن خدیج، جابر رضؓ بن عبداللہ، ابوہریرہ رضؓ، ابوسعید رضؓ خدری، زید رضؓ بن ثابت اور ثابت رضؓ بن ضحاک۔ سہولتِ بیان کی خاطر ہم ان میں سے ہر ایک کی روایات کو الگ الگ نقل کرتے ہیں۔

رافع رضؓ بن خدیج کی روایات

اس مسئلے نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ جن صحابی کے ذریعہ سے شہرت پائی ہے وہ حضرت رافع رضؓ بن خدیج ہی ہیں، اس لئے پہلے انہی کی روایات کو لیجیے۔

۱۔ رافعؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں زراعت کے لئے زمینیں لیتے تھے اور تہائی، چوتھائی، اور ایک خاص مقدار غلہ کرایہ کے طور پر مقرر کرتے تھے۔ ایک روز میرے چچاؤں میں سے ایک آئے اور انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ایک ایسے کام سے روک دیا ہے جو ہمارے لئے نافع تھا، مگر ہمارے لئے اللہ اور رسولؐ کی تابعداری زیادہ نافع ہے۔

نہانا ان نحاقل بالارض فنکریھا علی الثلث والربع والطعام المسمّٰی وامر رب الارض ان یَزْرعھا او یُزرعھا وکرہ کراءھا وما سوٰی ذالك۔

"آپؐ نے ہم کو اس بات سے منع کر دیا کہ ہم زمینوں میں مزارعت کا معاملہ کریں اور تہائی اور چوتھائی اور مقرر مقدار غلہ کے عوض انہیں کرایہ پر دیں۔ اور آپ نے حکم دیا ہے کہ مالکِ زمین یا تو خود کاشت کرے یا دوسرے کو کاشت کرنے کے لئے دے دے۔ اور آپ نے زمین کے کرایہ کو اور اس کے سوا دوسری صورتوں کو ناپسند فرمایا ہے" (مسلم)

۲۔ ایک اور روایت میں حضرت رافعؓ اپنے چچا کا نام ظُہَیر بن رافع بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اُن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تم لوگ اپنی کھیتی باڑی کا معاملہ کس طرح کرتے ہو؟ انہوں نے مزارعت کی تفصیل بتائی۔ اس پر آپ نے فرمایا:۔

فلا تفعلوا، اِزرَعوھا او اَزرِعوھا او امسکوھا۔

"ایسا نہ کیا کرو۔ یا خود زراعت کرو، یا دوسروں کو زراعت کے لئے دے دو، یا اپنی زمینوں کو روک رکھو" (مسلم۔ بخاری۔ ابن ماجہ)

۳- ایک اور روایت میں حضرت رافعؓ خود اپنا قصہ بیان کرتے ہیں کہ وہ اپنی کھیتی کو پانی دے رہے تھے۔ وہاں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ہوا۔ آپ نے پوچھا یہ کس کی کھیتی ہے اور کس کی زمین ہے؟ انہوں نے عرض کیا:۔

زرعی ببذری وعملی، لی الشطر ولبنی فلان الشطر۔

"میری کھیتی ہے۔ اس میں تخم اور عمل میرا ہے۔ آدھی پیداوار میری ہوگی اور آدھی بنی فلاں کی"

اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اربیتما، فرد الارض علیٰ اھلھا وخذ نفقتک۔

"تم نے سودی معاملہ کیا۔ زمین اس کے مالکوں کو واپس کردو اور اپنا خرچ ان سے وصول کرلو"[۱] (ابوداؤد)

۴- مجاہد کی روایت ہے کہ رافع بن خدیج نے کہا:۔

نھانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن امر کان لنا نافعاً اذا کانت لاحدنا ارض ان یعطیھا ببعض خراجھا یدراھم وقال اذا کانت لاحدکم ارض فلیمنحھا اخاہ اولیزرعھا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ایک ایسے کام سے روک دیا جو ہمارے لئے نافع تھا، یعنی اس بات سے کہ اگر ہم میں سے کسی کے پاس

---

[۱] اس حدیث کے سلسلۂ سند میں ایک راوی بکر بن عامر البجلی ہے جس کے معتبر ہونے میں کلام کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو نیل الاوطار۔ جلد ۵۔ صفحہ ۲۳۴)

کوئی زمین ہو تو وہ اُسے اُس کی پیداوار اور نقدی کے عوض زراعت کے لئے
کسی دوسرے شخص کو دے، اور آپؐ نے فرمایا کہ اگر تم میں سے کسی کے پاس
کوئی زمین ہو تو یا وہ اپنے کسی بھائی کو یونہی دیدے یا خود کاشت کرے۔" (ترمذی)

۵۔ سعید بن مُسَیّب نے رافعؓ بن خدیج سے یہ روایت نقل کی ہے۔

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن المحاقلۃ والمزابنۃ وقال انما یزرع ثلثۃ، رجل لہ ارض فیزرعھا، ورجل مُنح ارضا فھو یزرع ما مُنِح، ورجل استکریٰ ارضا بذھب او فضۃ۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محاقلہ (بٹائی پر کاشت کرانے) اور مزابنہ (درختوں پر کھجور کی بیع) سے منع فرمایا اور فرمایا کہ زراعت تین ہی آدمی کر سکتے ہیں۔ ایک وہ جس کی اپنی زمین ہو اور وہ اس میں خود کاشت کرے۔ دوسرا وہ جسے کوئی زمین یونہی دے دی جائے اور وہ اس میں کھیتی باڑی کرے۔ تیسرا وہ جو سونے اور چاندی کے عوض زمین کرائے پر لے۔" (ابوداؤد، ابن ماجہ، نسائی)۔

مگر نسائی نے ایک دوسری روایت کے ذریعہ سے یہ بتایا ہے کہ دراصل اس حدیث کا صرف پہلا ٹکڑا، یعنی نھی عن المحاقلۃ والمزابنۃ ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمایا ہوا ہے۔ باقی کلام سعید بن مُسَیّب کا اپنا تشریحی کلام ہے جو لعبارت میں اصل حدیث کے ساتھ خلط ملط ہو گیا۔

۶۔ سلیمان بن یسار نے رافع بن خدیج سے جو روایت نقل کی ہے اس میں وہ اپنے کسی چچا کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے آکر کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا ہے :۔

من کانت لہ ارض فلا یکریہا بطعام مسمّٰی۔

"جس کے پاس کوئی زمین ہو وہ غلّے کی ایک مقدار ٹھیرا کر اسے کرائے پر نہ دے"

اور دوسری روایت کی رُو سے اُن کے چچا نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :۔

من کانت لہ ارض فلیزرعہا اولیزرعہا اخاہ ولا یکاریہا بثلث ولا بربع ولا بطعام مسمّٰی۔

"جس کے پاس کوئی زمین ہو اسے چاہیئے کہ یا خود زراعت کرے یا اپنے کسی بھائی کو زراعت کے لئے دے دے، مگر کرائے پر نہ دے، نہ تہائی پیداوار پر، نہ چوتھائی پر، اور نہ ایک مقرر مقدار غلّہ پر" (ابن ماجہ، ابوداؤد، نسائی)۔

۷۔ رافعؓ بن خدیج کے صاحبزادے اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ابو رافع نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے آکر ہم لوگوں کو بتایا کہ :۔

نہانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن امر کان یرفق بنا، وطاعۃ اللہ وطاعۃ رسولہ ارفق، نہانا ان یزرع احدنا الا ارضاً یملک رقبتہا او منیحۃ یمنحہا رجل۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ایک ایسے کام سے روک دیا ہے جو ہمارے لئے فائدہ مند تھا، مگر اللہ کی اطاعت اور اس کے رسول

کی اطاعت ہمارے لئے زیادہ فائدہ مند ہے۔ آپ نے ہمیں اس بات سے منع فرمادیا کہ کوئی شخص کسی زمین میں زراعت کرے الا یہ کہ یا تو وہ خود اس زمین کا مالک ہو، یا کوئی دوسرا شخص اس کو بلامعاوضہ زراعت کیلئے دے دے۔" (ابوداؤد)

۸۔ ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ ہم اپنی زمین کرائے پر دیا کرتے تھے پھر جب ہم نے رافعؓ بن خدیج کی حدیث سنی تو یہ کام چھوڑ دیا۔ دوسری روایت میں ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ہم مخابرہ (یعنی بٹائی پر کاشت کا معاملہ) کرتے تھے اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے۔ پھر رافع نے دعویٰ کیا کہ اللہ کے نبیؐ نے اس سے منع کیا تھا۔ لہٰذا ان کے قول کی وجہ سے ہم نے اسے چھوڑ دیا۔ (مسلم۔ ابوداؤد۔ ابن ماجہ)

جابرؓ بن عبداللہ کی روایات

رافعؓ بن خدیج کے بعد اس مضمون کے احکام کا دوسرا بڑا ماخذ جابرؓ بن عبداللہ کی روایات ہیں۔ ان میں حسب ذیل احادیث وارد ہوئی ہیں:۔

۱۔ نہیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن کراء الارض۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کے کرائے سے منع فرمادیا۔" (مسلم)

۲۔ نہیٰ عن المخابرۃ۔

"آنحضرتؐ نے مخابرہ (بٹائی پر کاشت کرانے) سے منع فرمادیا۔" (مسلم)

۳۔ نہیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان نوخذ الارض اجرًا او حظًا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ زمین اجرت

پر یا پیداوار کے حصے پر کاشت کے لئے لی جائے۔" (مسلم)

۴ - من کانت لہ ارض فلیزرعھا فان لم یزرعھا فلیزرعھا اخاہ۔

"جس کے پاس کوئی زمین ہو اُسے چاہیئے کہ خود کاشت کرے، اور اگر خود نہ کرتا ہو تو اپنے کسی بھائی کو کاشت کے لئے دے دے۔"

یہ حدیث مختلف روایتوں میں مختلف الفاظ کے ساتھ آئی ہے۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:-

من کانت لہ فضل ارض فلیزرعھا اولیمنحھا اخاہ فان ابیٰ فلیمسک ارضہ۔

"جس کے پاس فاضل زمین ہو اسے چاہیئے کہ یا خود کاشت کرے یا اپنے کسی بھائی کو دے دے، لیکن اگر وہ نہ دینا چاہے تو پھر اپنی زمین کو روک رکھے۔"

دوسری روایت میں ہے۔

فلیھبھا اولیعرھا۔

"اسے چاہیئے کہ ہبہ کر دے یا عاریتہً دے دے۔"

ایک اور روایت میں ہے۔

ولا یواجرھا ایاہ۔

"اس کو اجرت پر نہ دے۔"

ایک اور روایت میں ہے۔

دلا یکس بہا۔

"اس کو کرایہ پر نہ دے۔" (مسلم، بخاری، ابن ماجہ)

۵۔ نہٰی عن بیع ارض البیضاء سنتین او ثلاثاً۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خالی زمین کو دو تین سال کے لئے بیچنے سے منع فرمایا۔"

دوسری روایت میں ہے۔

عن بیع السنین۔

"چند سال کے لئے بیع کرنے سے۔"

ایک اور روایت میں ہے۔

عن بیع ثمر سنین۔

"چند سال کے ثمرہ کی بیع سے۔" (مسلم)

۶۔ سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ینہٰی عن المزابنۃ والحقول۔

"جابرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مزابنہ اور حقول سے منع کرتے ہوئے سُنا۔"

پھر حضرت جابرؓ نے خود ہی "مزابنہ" کی تشریح یہ کی کہ اس سے مراد "کھجوروں کے بدلے ثمرہ بیچنا ہے۔" اور "حقول" کی تشریح میں کہا کہ اس سے مراد "زمین کو کرایہ پر دینا ہے۔" (مسلم)

۷۔ سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من لـم

بذر المخابرۃ فلیؤذن بحرب من اللہ ورسولہ۔

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ جو شخص مخابرہ نہ چھوڑے اس کو اللہ اور رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے" (ابوداؤد)

مزید تائیدی روایات

باقی چار صحابیوں کی روایات جو مذکورہ بالا احادیث کی مزید تصدیق و تائید کرتی ہیں، حسبِ ذیل ہیں:۔

حضرت ابوہریرہؓ سے:۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کانت لہ ارض فلیزرعہا اولیمنحہا اخاہ فان ابی فلیمسک ارضہ۔ (بخاری، مسلم، ابن ماجہ)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کے پاس زمین ہو وہ یا تو خود کاشت کرے، یا اپنے بھائی کو بلا معاوضہ دے دے۔ لیکن اگر وہ نہ دینا چاہے تو اپنی زمین کو روک رکھے"

نہی عن المحاقلۃ والمزابنۃ۔ (مسلم۔ ترمذی)

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محاقلہ اور مزابنہ سے منع فرمایا"

حضرت ابوسعیدؓ خدری سے:۔

نہی عن المزابنۃ والمحاقلۃ۔ والمزابنۃ اشتراء الثمر فی رؤس النخل۔ والمحاقلۃ کراء الارض۔ (مسلم۔ ابن ماجہ)

"حضورؐ نے مزابنہ اور محاقلہ سے منع فرمایا۔ مزابنہ سے مراد درختوں پر کھجور

کے ثمرہ کی خریداری ہے۔ اور محاقلہ سے مراد زمین کا کرایہ ہے۔"

ثابت رضؓ بن ضحاک سے:۔

نهى عن المزارعة۔ (مسلم)

"حضورؐ نے مزارعت سے منع فرما دیا۔"

زیدؓ بن ثابت سے:۔

نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن المخابرة۔ قلت وما المخابرة؟ قال ان تاخذ الارض بنصف او ثلث او ربع

(ابوداؤد)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مخابرہ سے منع فرمایا۔ ثابت بن حجاج نے حضرت زید بن ثابت سے پوچھا کہ مخابرہ کے کیا معنی ہیں؟ حضرت زیدؓ نے جواب دیا اس کا مطلب یہ ہے کہ تم آدھی یا تہائی یا چوتھائی پیداوار کے عوض زمین لو۔"

تنقید بلحاظ نقل و روایت

اوپر ہم نے وہ تمام روایات لفظ بلفظ نقل کر دی ہیں جن پر اس مسئلے کا مدار ہے کہ اسلام میں بٹائی اور نقد لگان کی ممانعت کی گئی ہے اور خود کاشت کرنے یا مفت زمین عطا کر دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ غالباً اس سلسلہ کی کوئی قابلِ ذکر اور لائق اعتناء روایت ہم سے چھوٹ نہیں گئی ہے۔ آیئے اب ہم ذرا ان پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ آیا فی الواقع اس معاملہ میں اسلام کا مسلک وہی ہے جو ان کثیر التعداد روایات سے ظاہر ہوتا ہے؟

ہر شخص جانتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محض ایک مفتی اور معلم ہی نہ تھے

بلکہ ملک کے حاکم بھی تھے اور عملاً پورا نظم و نسق آپ کے ہاتھ میں تھا۔

ہر شخص یہ بھی جانتا ہے کہ زمین کا معاملہ دو چار یا دس پانچ افراد کی نجی اور شخصی زندگی کا کوئی اتفاقی و ہنگامی معاملہ نہیں ہے کہ اس کا حکم بس چند آدمیوں کے کان میں چپکے سے کہہ دیا جاتا۔ یہ تو ایک پوری سلطنت کے نظم و نسق سے تعلق رکھنے والی چیز ہے جس سے لاکھوں آدمیوں کی معیشت مستقل طور پر متاثر ہوتی ہے۔ لہٰذا اس معاملہ میں جو پالیسی بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کی تھی وہ آپ کے زمانہ میں اور آپ کے خلفاء کے زمانے میں ایک نہایت مشہور و معروف بات ہونی چاہیئے تھی۔

پھر کوئی ایسا شخص جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و شخصیت اور آپ کے خلفاء راشدین کی زندگی اور آپ کے صحابۂ کرام کے حالات سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہو یہ گمان بھی نہیں کر سکتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ اُن لوگوں میں سے تھے جو زبان سے ایک چیز کو غلط کہیں اور اسے رائج رہنے دیں اور زبان سے ایک دوسرے طریقہ کو برحق کہیں اور عملاً اس کو جاری نہ کریں۔ یا یہ کہ حضور ایک طریقہ کو روکنا اور دوسرے طریقے کو رائج کرنا چاہتے ہوں اور صحابۂ کرام مان کر نہ دیں۔ یا یہ کہ خلفاء راشدین کو یہ معلوم ہو چکا ہو کہ حضورؐ کسی رواج کا انسداد کر کے ایک دوسرا اصلاحی طریقہ جاری کرنا چاہتے تھے اور پھر وہ اپنے تمام زمانہ خلافت میں آپ کے منشا کو عملی جامہ پہنانے سے باز رہ جائیں۔

یہ تین حقیقتیں ایسی ظاہر و باہر ہیں جن سے کسی صاحب عقل و فکر اور صاحب علم و نظر آدمی کے لئے مجال انکار نہیں ہے۔ اب اگر آپ یہ سنیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر امیر معاویہؓ کی خلافت کے وسط تک یعنی تقریباً ۵۰ سال تک مذکورۂ بالا پانچ چھ اصحاب کے سوا کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بٹائی اور لگان پر

زمین کاشت کے لئے دینے کو منع فرمایا ہے، اور یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود اور تمام اکابر صحابہؓ اور آپؐ سے قریب ترین تعلق رکھنے والے تمام بڑے بڑے گھرانے بٹائی پر زمینیں دیتے رہے، اور یہ کہ خلافتِ راشدہ کے پورے عہد میں یہی طریقہ رائج رہا، تو کیا آپ حیرت سے ٹک دک نہ رہ جائیں گے؟ حقیقت میں یہ ہے نہایت حیرت انگیز بات، مگر واقعہ یہی ہے۔ ہم ان روایات کو یہاں نمبروار نقل کرتے ہیں جن سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

(۱) نافعؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنی زمینیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور آپؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں برابر کرائے پر دیتے رہے۔ امیر معاویہؓ کی خلافت کے ابتدائی زمانہ میں بھی ان کا یہی طریقہ رہا۔ یہاں تک کہ جب امیر معاویہؓ کی خلافت کا آخری زمانہ آیا (یعنی تقریباً ۵۰ھ یا اس کے بعد کا زمانہ) تو ان کو یہ خبر پہنچی کہ رافعؓ بن خدیج نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس فعل کی ممانعت کا حکم روایت کرتے ہیں۔ یہ سن کر وہ رافعؓ بن خدیج سے ملنے گئے اور میں اُن کے ساتھ تھا۔ انہوں نے رافع سے پوچھا کہ یہ کیا روایت ہے جو تم بیان کرتے ہو؟ رافع نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زمینوں کے کرائے سے منع فرماتے تھے۔ اس پر ابن عمرؓ نے زمینیں کرائے پر دینی بند کر دیں، اور جب کبھی اُن سے اس کے متعلق پوچھا جاتا تو وہ جواب دیتے کہ رافع بن خدیجؓ کا دعویٰ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرما دیا تھا۔

اسی سے ملتی جلتی روایت خود حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے صاحبزادے حضرت سالمؒ روایت کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں کہ حضرت عبداللہؓ کے سوال پر حضرت رافعؓ نے

ان کو جواب دیا کہ میں نے اپنے دو چچاؤں کو، جو بدری صحابی تھے، گھر والوں سے یہ کہتے سنا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کے کرایے سے منع کیا ہے۔ اس پر حضرت عبد اللہ نے فرمایا:-

لقد کنت اعلم فی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الارض تکری۔

"مجھے معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں زمینیں کرایے پر دی جاتی تھیں"

مگر حضرت عبد اللہؓ نے اس ڈر سے کہ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا ہو اور مجھے نہ معلوم ہوا ہو، اپنی زمینیں کرایے پر دینی بند کر دیں۔ (بخاری، مسلم، ابو داؤد، ابن ماجہ)

دیکھیے۔ عبد اللہ بن عمرؓ وہ شخص ہیں جن کی حقیقی بہن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں تھیں۔ جن کے والد حضرت عمرؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے معتمد ترین وزیر رہے اور پھر خود دس سال تک اسلامی حکومت کے خلیفہ رہے۔ کیا یہ ممکن تھا کہ اُن کو پورے زمانۂ نبوت اور پورے زمانۂ خلافتِ راشدہ میں یہ خبر نہ ہوتی کہ زمینوں کے بارے میں اسلام کا قانون کیا ہے؟ اور کیا یہ ممکن تھا کہ حضرت عمرؓ کی زندگی میں ان کا اپنا بیٹا خود ان کی طرف سے اُن کے گھر کی زمینداری کا انتظام ایسے طریقے پر کرتا رہتا جو اسلامی قانون میں ممنوع تھا؟[۱]

---

[۱] یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کو یہ اطمینان تھا کہ مزارعت اور کرایۂ زمین ناجائز نہیں ہے تو پھر رافعؓ بن خدیج کی روایت سُن کر انہوں نے یہ طریقہ چھوڑ کیوں دیا؟ (باقی بر صفحہ ۶۹)

یہ بظاہر ایک شبہ میں ڈالنے والی بات ہے۔ لیکن جو شخص حضرت ابن عمرؓ کی طبیعت اور ان کے مزاج سے واقف ہو وہ اس طرح کی کسی غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے مزاج میں احتیاط و ورع کی حد سے گزر کر تشدد تک پہنچ گئی تھی اور آخر عمر میں تو اس نے ایک حد تک وہم کی سی صورت اختیار کر لی تھی۔ مثلاً وہ وضو میں اتنا مبالغہ کرتے تھے کہ آنکھوں کے اندرونی حصوں کو بھی دھویا کرتے تھے، یہاں تک کہ آخر کار اسی کی وجہ سے ان کی بینائی جاتی رہی۔ اپنے بچوں کو اگر پیار کر لیتے تو پھر کلی کئے بغیر نماز نہ پڑھتے۔ اگر دورانِ نماز میں امام کے ساتھ آکر شامل ہوتے تو بعد میں صرف چھوٹی ہوئی نماز ہی ادا نہ کرتے بلکہ سجدۂ سہو بھی کرتے تھے۔ (تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو زاد المعاد، جلد ا۔ صـ۲۲۶)۔ اس شدتِ احتیاط کی بنا پر اگر انہوں نے رافع بن خدیج کی حدیث سن کر اپنی زمینیں کرائے پر دینی بند کر دیں تو اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ انہیں اُس عمل کی صحت میں واقعی کوئی شک ہو گیا تھا جسے وہ پچاس برس تک زمانۂ نبوت و خلافتِ راشدہ میں کرتے رہے تھے اور جس پر اکابر صحابہ و خلفائے راشدین کو اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عمل کرتے دیکھ چکے تھے۔ اگر ان کے دل میں مزارعت کے جواز کے متعلق ذرہ برابر بھی کوئی شک ہوتا تو کیسے ممکن تھا کہ ان کی زبان سے یہ شکایت آمیز فقرہ نکلتا جیسا کہ مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ

لقد منعنا رافع نفع ارضنا۔

"رافعؓ نے ہم کو ہماری زمین کے نفع سے محروم کر دیا"

کیا کوئی شخص یہ توقع کر سکتا ہے کہ ابن عمرؓ کو اگر کسی درجہ میں بھی یہ گمان ہوتا کہ یہ واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے تو ان کی زبان اس پر حرفِ شکایت سے آلودہ ہو سکتی تھی؟۔

(۲) ابن عمرؓ ہی کی روایت ہے، اور عبداللہ بن عباسؓ اور انسؓ بن مالک کی روایات اس کی تصدیق کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر پر حملہ کیا۔ اس کا کچھ حصّہ صلحاً فتح ہوا اور کچھ بزورِ شمشیر مغلوب ہوا۔ آنحضرتؐ نے آدھے علاقے کو حکومت کی ضروریات کے لئے مخصوص فرما دیا اور آدھے علاقے کو اٹھارہ سو حصوں میں تقسیم کر کے اُن پندرہ سو مجاہدین پر بانٹ دیا جو غزوۂ خیبر میں شریک تھے (یعنی بارہ سو پیادوں کا اکہرا حصّہ اور تین سو سواروں کا دوہرا حصّہ)۔ پھر آپ نے ارادہ فرمایا کہ یہودی باشندوں کو علاقۂ مفتوحہ سے نکال دیں۔ مگر یہودیوں نے آکر عرض کیا کہ آپ ہمیں یہاں رہنے دیں، ہم آپ کی طرف سے یہاں کاشت کریں گے آدھی پیداوار آپ لے لیجئے گا اور آدھی ہم لے لیں گے۔ آنحضرتؐ نے یہ دیکھ کر کہ آپ کے پاس کام کرنے والے آدمیوں کی کمی ہے، ان کی بات مان لی، اور ان سے فرمایا کہ ہم جب تک چاہیں گے تم کو رکھیں گے اور جب چاہیں گے تمہیں یہاں سے نکال دیں گے۔ چنانچہ ان شرائط پر آپ نے ان سے معاملہ طے کر لیا۔ وہ کاشتکاروں کی حیثیت سے خیبر میں کام کرتے تھے۔ آدھی زمین کی مالک حکومت تھی اور بقیہ نصف کے مالک وہ پندرہ۱۵۰۰ سو حصہ دار تھے جن پر اٹھارہ سو قطعات تقسیم کئے گئے تھے۔ بٹائی کے معاہدے کی رو سے جو نصف پیداوار وہاں سے آتی تھی اس کو حکومت اور حصہ داروں کے درمیان تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا حصّہ بھی عام حصّہ داروں کے ساتھ تھا۔ چنانچہ آپ اس میں سے ہر سال ایک خاص مقدار میں غلّہ اور کھجوریں اپنی ازواجِ مطہرات کو برابر برابر دیا کرتے تھے۔ یہ بندوبست حضورؐ کے آخر حیات تک جاری رہا۔ اسی پر حضرت

ابوبکرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں عمل کیا۔ اسی پر حضرت عمرؓ اپنے ابتدائی زمانہ میں کاربند رہے۔ پھر جب یہودیوں نے خیبر میں پیہم شرارتیں کیں اور حضرت عمرؓ کی رائے یہ ہوئی کہ معاہدے کے مطابق ان کو وہاں سے نکال دیا جائے، تو آپ نے اعلان کیا کہ خیبر میں جس جس کا حصہ ہے وہ جا کر اپنی اپنی زمین سنبھال لے۔ ازواجِ مطہرات کے سامنے حضرت عمرؓ نے یہ تجویز پیش کی کہ آپ میں سے جو جو پسند کریں وہ اتنی زمین لے لیں جس کی پیداوار اسی قدر ہو جس قدر غلہ اور ثمرہ آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے ملتا آرہا ہے، اور جو چاہیں اپنے حصہ کی زمین حکومت کے انتظام میں رہنے دیں اور اتنا ہی غلہ اور ثمرہ حکومت سے لیتی رہیں۔ اس تجویز کے مطابق بعض ازواجِ مطہرات نے غلہ اور ثمرہ پسند کیا۔ اور حضرت عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما نے زمین لے لی[1]۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے یہودیوں کو خیبر سے منتقل کر کے تیمار اور اریحار میں بسا دیا۔ (بخاری، مسلم، احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

یہ عہد نبوت و خلافت کے مشہور ترین واقعات میں سے ہے اور اس کی صحت میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اس میں صریح طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بٹائی پر زمین کاشت کے لئے دی ہے، اپنی طرف سے بھی،

---

[1] واضح رہے کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث نہیں تھی جو آپؐ کی ازواج میں تقسیم ہوئی، بلکہ آنحضرتؐ کی بیویوں کو چونکہ تمام امت کی مائیں قرار دیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو آپؐ کے بعد نکاح سے روک دیا تھا اس لئے ان کا نفقہ امت پر واجب تھا۔

حکومت کی طرف سے بھی، اور اُن پندرہ سو افراد کی طرف سے بھی جن کا حصہ خیبر میں تھا۔ اس طریقہ پر آپ اپنے آخری لمحہ حیات تک عامل رہے، اور آپ کے بعد شیخین کا عمل بھی اسی پر رہا۔ کیا اس کے بعد بھی کسی کو یہ گمان ہو سکتا ہے کہ اسلامی قانون میں بٹائی پر زمین کاشت کے لئے دینا ممنوع تھا؟

اس کے جواب میں جو لوگ کہتے ہیں کہ خیبر کا معاملہ بٹائی کا نہیں بلکہ خراج کا معاملہ تھا، ان کی بات صحیح نہیں ہے۔ خیبر کی آدھی زمین جو حکومت کی مِلک قرار دی گئی تھی اُس کی بٹائی تو بے شک خراج تھی۔ لیکن جو بقیہ نصف اراضی مجاہدین کے درمیان تقسیم کر دی گئی تھیں اُن کی بٹائی کو "خراج" کا نام کیسے دیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ "خیبر کے یہودی باقاعدہ ذمی رعایا نہ تھے، کیونکہ ان پر جزیہ نہیں لگایا گیا تھا، اس لئے مسلمان مجاز تھے کہ ان سے جو چاہتے لیتے"، اُن کی بات بھی صحیح نہیں ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ قرآن مجید میں جزیہ کے احکام غزوۂ خیبر کے وقت نازل ہی نہ ہوئے تھے۔ پھر بھلا احکام جزیہ کی غیر موجودگی میں جزیہ نہ عائد کئے جانے پر کسی قانونی استدلال کی بنا کیسے رکھی جا سکتی ہے؟ اہلِ خیبر کا ذمی ہونا تو اس سے ظاہر ہے کہ اسلامی حکومت نے ان کو ایک باضابطہ قرارداد کے مطابق اپنے ملک میں آباد رہنے دیا، ان پر خراج عائد کیا اور ان پر دیوانی و فوجداری قوانین اسی طرح نافذ کئے جس طرح وہ مسلمان رعایا پر نافذ کئے جا رہے تھے۔ ابوداؤد کی روایت ہے کہ جب خیبر کی قرارداد ہو چکی اور مسلمان یہودیوں کی بستیوں میں چلنے پھرنے لگے تو بعض مسلمان یہودیوں پر کچھ دست درازی کر بیٹھے۔ اس کی شکایت یہودیوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کی۔ اس پر آپؐ نے ایک خطبہ دیا اور اس میں فرمایا کہ "اللہ

نے تمہارے لئے یہ حلال نہیں کیا ہے کہ اہل کتاب کے گھروں میں بلا اجازت گھسو اور ان کے بال بچوں کو مارو پیٹو اور ان کے پھل کھا جاؤ، حالانکہ جو کچھ ان پر واجب تھا وہ انہوں نے تم کو ادا کر دیا ہے۔" کیا یہ اہل خیبر کے ذمی ہونے کی کھلی دلیل نہیں ہے؟ اسلامی قانونِ فوجداری میں قسامت کے قاعدہ کا تو ماخذ ہی وہ واقعہ ہے جو خیبر میں ایک مسلمان کے خفیہ قتل کا پیش آیا تھا۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ یہودیوں کو قانون کی نگاہ میں مسلمانوں کے برابر حیثیت حاصل تھی۔ اگر کہا جائے کہ جب یہ بات تھی تو آیتِ جزیہ کے نزول کے بعد ان پر جزیہ کیوں نہ لگایا گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جن لوگوں کے ساتھ نزولِ آیت سے پہلے ایک معاہدہ طے ہو چکا تھا ان پر ایک نئی شرط کا اضافہ کر دینا کیونکر جائز ہو سکتا تھا۔ اگر کہا جائے کہ جب وہ ذمی تھے تو پھر ان کو خیبر سے نکالا کیوں گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا اخراج اس قرارداد کے مطابق تھا جو انہیں ذمی بناتے وقت اُن سے طے ہو چکی تھی۔ نیز یہ بھی یاد رہے کہ حضرت عمرؓ نے ان کو صرف حجاز سے نکالا تھا سلطنت سے نہیں نکال دیا تھا۔ اپنے سلطنت کے ایک حصہ سے ان کو منتقل کیا اور دوسرے حصے (یعنی تیمار اور اریحار) میں لے جا کر بسا دیا۔[1]

پھر جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ معاملہ مزارعت کا نہیں تھا کیونکہ اس میں مدت کا تعین نہ ہوا تھا، ان کی بات بھی صحیح نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو معاملہ ان سے طے کیا تھا اس میں منجملہ شرائط کے ایک شرط یہ بھی تھی کہ:-

نقرکم بھا علی ذالک ما شئنا۔

"ہم اس قرارداد پر جب تک چاہیں گے تم کو یہاں رکھیں گے۔"

---

[1] اس مسئلے پر مفصل بحث کے لئے علامہ ابن القیم کی زاد المعاد جلد دوم میں حسب ذیل مقامات ملاحظہ ہوں۔ ص ۹-۱۰۸، ۱۱۱، ۲۰۱، ۲۰۶۔

اس میں مدت کا تعین بلحاظ وقت نہیں بلکہ بلحاظ مشیتِ مالک کیا گیا تھا، اور یہ اُن مخصوص حالات کی وجہ سے تھا جن میں اُس وقت یہودیوں سے معاملہ طے ہوا تھا۔ اتنی سی بات کی وجہ سے یہ فیصلہ کر دینا درست نہیں ہے کہ خیبر کا معاملہ سرے سے مزارعت کا معاملہ ہی نہ تھا، حالانکہ اپنی دوسری تفصیلات میں وہ صریحاً ایک مزارعت کا معاملہ نظر آتا ہے[1]

(۳) حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے (اور خیال رہے کہ یہ حضرت ابوہریرہؓ وہی ہیں جن سے اوپر بٹائی اور لگان کی ممانعت اور خود کاشت کرنے یا مفت زمین دینے کی ہدایت نقل کی جا چکی ہے) کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو انصار نے آکر عرض کیا:

اقسم بیننا وبین اخواننا النخل۔

"آپ ہمارے نخلستانوں کو ہمارے درمیان اور ہمارے مہاجر بھائیوں کے درمیان بانٹ دیں"

مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر انصار نے

---

[1] واضح رہے کہ حنفیہ کے نزدیک مزارعت کے لئے مدت کا تعین ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ لسان الحکام میں ہے وفی النوازل عن محمد بن سلمۃ المزارعۃ من غیر بیان المدۃ جائزۃ (ایضاً ص۱۹۵)۔ اور الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں مذہب حنفی کے احکام بیان کرتے ہوئے لکھا ہے ویصح عقد المزارعۃ بدون بیان المدۃ اذا کان وقت الزرع معروفا (جلد ۳ ص۹)۔

مہاجرین سے کہا:

تکفونا العمل ونشرککم فی الثمرۃ۔

"آپ لوگ ہماری طرف سے ان نخلستانوں میں کام کریں، اور ہم آپ کو ثمرہ میں شریک کریں گے"

اس پر مہاجرین نے کہا:

سمعنا واطعنا۔

"یہ بات بخوشی منظور ہے" (بخاری)

(۴) قیس بن مسلم حضرت ابوجعفر یعنی (امام محمدؒ باقر رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں کہ مدینے میں مہاجرین کا کوئی گھرانہ ایسا نہ تھا جو تہائی یا چوتھائی حصہ پیداوار کے عوض کاشت نہ کرتا ہو۔ امام بخاری اس روایت کو نقل کرنے کے بعد پھر اس کی تائید میں مزید نظائر پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بٹائی پر معاملہ حضرت علیؓ نے کیا ہے، سعد بن مالک اور عبداللہ بن مسعودؓ نے کیا ہے، عمر بن عبدالعزیزؒ اور قاسم اور عُروہ نے کیا ہے[1]، آلِ ابوبکرؓ، آلِ علیؓ، آلِ عمرؓ[2] سب بٹائی پر کاشت کرتے رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ لوگوں سے اس طرح معاملہ کیا کرتے تھے کہ اگر "عمرؓ

---

[1] قاسم بن ابی بکرؓ کے اثر کو پوری سند کے ساتھ عبدالرزاق نے اور باقی پانچوں بزرگوں کے آثار کو سند کے ساتھ ابن ابی شیبہ نے بیان کیا ہے۔

[2] ان تینوں خاندانوں میں مزارعت کا رواج ہونے کی پوری سند عبدالرزاق اور ابن ابی شیبہ نے دی ہے۔

اپنے پاس سے بیج دے گا تو آدھی پیداوار لے گا اور اگر کاشت کار اپنا بیج لائیں تو اُن کا حصہ اتنا ہوگا۔[1] (بخاری۔ باب المزارعۃ بالشطر ونحوہ)۔

(۵) حضرت ابو جعفرؓ (امام محمد باقر) کی ایک اور روایت ہے جس میں وہ تصریح کرتے ہیں کہ:

کان ابوبکر یعطی الارض علی الشطر۔

"حضرت ابوبکرؓ اپنی زمین نصف نصف کی بٹائی پر زراعت کیلیے دیتے تھے" (طحاوی)

(۶) ابن ابی شیبہ نے حضرت علیؓ کا قول نقل کیا ہے کہ:

لاباس بالمزارعۃ بالنصف۔

"نصف نصف کی بٹائی پر زمین کاشت کیلیے دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے"

(کنز العمال)۔

(۷) طاؤس کی روایت ہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ اپنی زمین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور آپؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں تہائی اور چوتھائی پیداوار کی بٹائی پر زراعت کے لئے دیتے رہے (ابن ماجہ)۔ اس حدیث میں غلطی صرف اتنی ہے کہ طاؤس نے حضرت عثمانؓ کے عہد کا بھی ذکر کر دیا ہے، حالانکہ حضرت معاذؓ کا انتقال حضرت عمرؓ کے زمانے میں ہو چکا تھا۔ لیکن محض اس غلطی کی بنا پر طاؤس جیسے شخص کی پوری روایت کو غلط

---

[1] حضرت عمر رضی اللہ کے اس عمل کو پوری سند کے ساتھ ابن ابی شیبہ اور بیہقی نے بیان کیا ہے۔

نہیں کہا جا سکتا[۱]۔ خصوصاً جب کہ اس روایت کی سند میں سب ثقہ لوگ ہیں۔
اب یہ سوچنے کی بات ہے کہ حضرت معاذؓ بن جبل وہ شخص ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کا قاضی اور عامل زکوٰۃ مقرر فرمایا تھا، جن کے متعلق حضور کا ارشاد تھا کہ:

اعلمھم بالحلال والحرام۔

"وہ صحابہ میں سب سے زیادہ حلال وحرام کی واقفیت رکھتے ہیں"

اور جنہیں حضرت عمرؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ کے بعد پورے شام کا فوجی گورنر مقرر کیا تھا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ ایسے شخص کو یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ زمین کے بارے میں اسلام کا قانون کیا ہے؟

(۸) موسیٰ بن طلحہؓ کی روایت ہے کہ حضرت عثمانؓ نے عبداللہ بن مسعودؓ، عمارؓ بن یاسر، خبابؓ بن ارت، اور سعدؓ بن مالک کو زمینیں عطا کی تھیں۔ ان میں سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور سعدؓ بن مالک اپنی زمینیں تہائی اور چوتھائی پیداوار کی بٹائی پر کاشت کے لئے دیتے تھے۔ (کتاب الخراج لابی یوسف)

---

[۱] طاؤس کے متعلق محدثین بالعموم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت معاذؓ کے حالات سے وہ خوب واقف تھے اور ان کے بارے میں ان کی روایات مستند ہیں اگرچہ وہ ان سے ملے نہیں تھے۔ چنانچہ امام شافعی لکھتے ہیں طاؤس عالم بامر معاذ وان لم یلقہ لکثرۃ من لقیہ ممن ادرک معاذا۔ اور ابن حجر اس قول کو نقل کرنے کے بعد اس پر اضافہ کرتے ہیں کہ وھذا مما لا اعلم عن احد فیہ خلافاً۔

ان شواہد و نظائر سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ مزارعت کا طریقہ عہدِ نبوت و خلافتِ راشدہ میں بالعموم رائج تھا۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ، اور صحابہؓ کے تمام زراعت پیشہ گھرانے اس پر عامل تھے، اور رافع بن خدیجؓ وغیرہ حضرات کی روایات پھیلنے تک پورے ۵۰ سال کے دوران میں کسی کو یہ بات سرے سے معلوم ہی نہ تھی کہ اس معاملہ میں کسی قسم کے امتناعی احکام موجود ہیں۔

تنقید بلحاظ عقل و درایت

اب ذرا اس معاملہ کو ایک دوسرے رُخ سے بھی دیکھئے۔ اسلام کے احکام ایک دوسرے کی ضد اور ایک دوسرے سے متناقض و متصادم نہیں ہیں۔ اس کی ہدایات اور اس کے قوانین میں سے ہر چیز اس کے مجموعی نظام میں اس طرح ٹھیک بیٹھتی ہے کہ دوسرے تمام احکام و قوانین کے ساتھ اس کا جوڑ مل جاتا ہے یہ وہ خوبی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس دین کے من جانب اللہ ہونے کا ایک نمایاں ثبوت قرار دیا ہے۔ لیکن اگر ہم یہ مان لیں کہ شریعت میں مزارعت ناجائز ہے، اور یہ کہ شارع زمین کی ملکیت کو خود کاشتی تک محدود کرنا چاہتا ہے، اور یہ کہ شارع آدمی کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ خود کاشتی کی حد سے زائد جتنی زمین اس کے پاس موجود ہو اسے یا تو دوسروں کو مفت دے دے یا بیکار ڈال رکھے، تو ذرا سا غور کرنے پر ہمیں علانیہ یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ احکام اسلام کے دوسرے اصول اور قوانین سے مناسبت نہیں رکھتے اور ان کو اسلامی نظام میں ٹھیک بٹھانے کے لئے دُور دُور تک اس نظام کی بہت سی چیزوں میں ترمیم

ناگزیر ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر تناقض کی چند نہایت صریح صورتیں ملاحظہ ہوں۔

۱- اسلامی نظام میں ملکیت کے حقوق صرف ہٹے کٹے مردوں تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ عورتوں، بچوں، بیماروں اور بوڑھوں کو بھی یہ حقوق پہنچتے ہیں۔ اگر مزارعت ممنوع ہو تو ان سب کے لئے زرعی ملکیت بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔

۲- اسلامی قانونِ وراثت کی رُو سے جس طرح ایک آدمی کی میراث اس کے مرنے پر بہت سے آدمیوں کے درمیان بٹ جاتی ہے، اسی طرح بسا اوقات بہت سے مرنے والوں کی میراث ایک آدمی کے پاس جمع بھی ہو سکتی ہے۔ اب یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اسلام کا قانونِ وراثت تو بیسیوں اور سینکڑوں ایکڑ تک زمین ایک شخص کے پاس سمیٹ لائے، مگر اُس کا قانونِ زراعت اُس کے لئے ایک محدود رقبے کے سوا باقی تمام ملکیت سے انتفاع کو حرام قرار دے۔

۳- اسلامی قانونِ بیع و شرا نے کسی نوعیت کی جائز اشیاء کے معاملہ میں کبھی انسان پر یہ پابندی عائد نہیں کی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ایک مخصوص حد تک ہی ان کو خرید سکتا ہو اور اس حد سے زیادہ کی خریداری کا مجاز نہ ہو۔ خرید و فروخت کا یہ غیر محدود حق جس طرح تمام جائز چیزوں کے معاملہ میں آدمی کو حاصل ہے اسی طرح زمین کے معاملہ میں بھی حاصل ہے۔ لیکن یہ بات پھر نہایت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ دیوانی قانون کی رُو سے تو ایک شخص جتنی چاہے زمین خرید سکے، مگر قانونِ زراعت کی رُو سے وہ ایک حدِ خاص سے زائد ملکیت کا نفع اُٹھانے کا حق دار نہ ہو۔

۴۔ اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی ہے۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہے۔ روپیہ، پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں ہے۔ پھر آخر تنہا زرعی جائداد میں وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر صرف اس ایک معاملہ میں شریعت کا میلان یہ ہو کہ آدمی کے حقوقِ ملکیت کو مقدار کے لحاظ سے محدود کر دیا جائے، یا انتفاع کے مواقع سلب کر کے ایک حدِ خاص سے زائد ملکیت کو آدمی کے لئے عملاً بیکار کر دیا جائے؟ [1]

۵۔ اسلام نے احسان اور فیاضی کی تعلیم تو زندگی کے ہر معاملہ میں دی ہے، لیکن واجبی حقوق وصول کر لینے کے بعد پھر کسی معاملہ میں بھی ہم اس کا یہ طریقہ نہیں دیکھتے کہ وہ فیاضی کو آدمی پر فرض قرار دیتا ہو۔ مثلاً جو شخص زکوٰۃ ادا کر چکا ہے، اسلام اس کو

---

[1] اس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ اسلام کا اصولی قانون تو یہی ہے جو اوپر ہم نے بیان کیا ہے۔ البتہ کسی خاص حالت میں یہ ضرورت محسوس ہو کہ زمین کی زیادہ سے زیادہ ملکیت کے لئے مقدار کی ایک حد مقرر کی جائے تو عارضی طور پر اتنی مدت کے لئے ایسا کیا جا سکتا ہے جب تک وہ ضرورت باقی رہے۔ لیکن اس طرح کے کسی فیصلے سے اسلام کے اصولی قانون میں کوئی مستقل ترمیم نہیں ہو سکتی۔ آگے چل کر ہم اس مسئلے پر مفصل بحث کر رہے ہیں۔

یہ ترغیب تو ضرور دیتا ہے کہ وہ اپنا ضرورت سے زائد روپیہ حاجتمند لوگوں کو بخش دے، مگر وہ اس بخشش وسخاوت کو فرض نہیں کرتا اور نہ یہ کہتا ہے کہ حاجتمند کو قرض کی شکل میں روپیہ دینا، یا مضاربت کے اصول پر روپیہ دے کر اس کے کاروبار میں شریک ہوجانا حرام ہے، بلکہ مدد صرف عطا اور بخشش ہی کی شکل میں ہونی چاہیئے۔ اسی طرح مثلاً جس شخص کے پاس ضرورت سے زائد مکانات ہوں، یا ایک بڑا مکان اس کی ذاتی ضرورت سے زیادہ کی گنجائش رکھتا ہو، اسلام بہت پسند کرتا ہے کہ آدمی اپنے ایسے مکانات اور گنجائشوں سے ان لوگوں کو فائدہ اٹھانے کا مفت موقع دے دے جو گھر نہ رکھتے ہوں۔ لیکن اس نے یہ نہیں کہا کہ یہ موقع لازماً مفت ہی دیا جانا چاہیئے، کرایہ پر مکان دینا حرام ہے۔ ایسا ہی معاملہ ضرورت سے زائد کپڑوں اور برتنوں اور سواریوں وغیرہ کا بھی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو فیاضانہ طریقہ سے مفت دے دینا پسند تو ضرور کیا گیا ہے مگر فرض نہیں کیا گیا اور فروخت کرنے یا کرایہ پر دینے کو حرام نہیں ٹھیرایا گیا۔ اب آخر زرعی زمین میں وہ کیا خصوصیت ہے جس کی بنا پر صرف اسی کے معاملہ میں اسلام اپنے اس عام اصول کو بدل دے اور آدمی سے اس کی پیداوار پر زکوٰۃ وصول کرلینے کے بعد اسے اس بات پر بھی مجبور کرے کہ وہ اپنی ضرورت سے زائد زمین لازماً دوسروں کو مفت دے دے اور شرکت یا مضاربت کے اصول پر ان سے معاملہ ہرگز نہ کرے۔

۶۔ اسلامی قانون نے تجارت، صنعت، اور معاشی کاروبار کے تمام شعبوں میں آدمی کو اس بات کی کھلی اجازت دی ہے کہ وہ نفع ونقصان کی شرکت کے اصول پر دوسروں کے ساتھ معاملہ کرلے۔ ایک شخص دوسرے کو اپنا روپیہ

دے سکتا ہے اور طے کر سکتا ہے کہ تو اس سے کاروبار کر، نفع ہو تو اس میں آدھے یا چوتھائی کا ہم حقدار ہوں۔ ایک شخص دوسرے کو اپنا سرمایہ کسی عمارت کی شکل میں، کسی مشین یا انجن کی شکل میں، کسی موٹر یا کشتی یا جہاز کی شکل میں بھی دے سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ تو اس پر کام کر، جو نفع ہو اس میں میرا اتنا حصہ ہے۔ لیکن آخر اس بات کے لئے کونسے معقول وجوہ ہیں کہ ایک شخص اپنا سرمایہ زمین کی شکل میں دوسرے کو دے کر یہ نہ کہہ سکے کہ تو اس میں کاشت کر، پیداوار میں تہائی یا چوتھائی یا نصف کا ہم شریک ہوں؟

یہ چند نمایاں ترین مثالیں ہیں جن پر نگاہ ڈال کر آدمی بیک نظر دیکھ سکتا ہے کہ یہ مزارعت کی حرمت اور یہ خود کاشتی کی قید، اور یہ ملکیت زمین کیلئے رقبے کی حد بندی اسلام کے مجموعی نظام میں کسی طرح ٹھیک نہیں بیٹھتی۔ اسے کھپانا ہو تو دوسرے بہت سے اصول و قوانین کو بدلنا پڑے گا۔ دوسرے اصول و قوانین اپنی جگہ رہیں تو یہ ہر قدم پر ان سے متصادم ہوتی رہے گی۔

امتناعی احکام کا اصل مفہوم

پھر کیا نقل اور عقل کے ان دلائل کی بنا پر یہ فیصلہ کر دیا جائے کہ وہ تمام احادیث غلط ہیں جو اس کثرت سے ثقہ راویوں نے اتنے صحابیوں سے روایت کی ہیں؟ نہیں، اصل بات یہ نہیں ہے کہ یہ روایتیں جھوٹی یا ضعیف ہیں۔ اصل حقیقت صرف یہ ہے کہ ان میں ادھوری بات بیان ہوئی ہے جس کی وجہ سے غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ خود رافع بن خدیج اور جابر بن عبداللہ وغیرہ حضرات کی دوسری روایتیں جب ہمارے سامنے آتی ہیں، اور بعض دوسرے جلیل القدر

صحابہ کی توضیحات کو جب ہم دیکھتے ہیں تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ در اصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کچھ اور تھا اور وہ روایات میں بیان کسی اور طرح ہو گیا۔

رافع بن خدیج کی توضیحات

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، امیر معاویہؓ کے ابتدائی دورِ حکومت تک تمام بلادِ اسلامیہ میں بالعموم سب ہی بٹائی اور لگان کا معاملہ کرتے تھے اور کسی کو یہ گمان تک نہ تھا کہ اس میں کسی قسم کی شرعی قباحت ہے۔ اس لئے جب ۵۰ھ کے لگ بھگ زمانہ میں یکایک یہ خبر مشہور ہوئی کہ بعض صحابی اس چیز کی ممانعت کا حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں تو ہر طرف ایک کھلبلی سی مچ گئی اور لوگ مجبور ہوئے کہ صحابۂ کرام کے پاس جا کر تحقیق کریں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فی الواقع کیا حکم دیا ہے، کن حالات میں دیا ہے، اور کس چیز کے متعلق دیا ہے؟ اس سلسلہ میں خود ان صحابیوں سے بھی پوچھ گچھ کی گئی جن سے مزارعت اور کرایۂ زمین کی ممانعت کے احکام مروی ہوئے تھے، اور دوسرے صحابہ سے بھی پوچھا گیا۔ اس طرح جو بات کھلی وہ ہم ذیل میں خود انہی بزرگوں کی زبان سے نقل کرتے ہیں۔

حنظلہ بن قیس کہتے ہیں، میں نے رافع بن خدیجؓ سے پوچھا سونے اور چاندی کی شکل میں زمین کا کرایہ طے کرنا کیسا ہے؟ انہوں نے کہا کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کے بعد انہوں نے مزید تشریح کے طور پر فرمایا:

انما کان الناس یواجرون علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم علی الماذیانات واقبال الجداول واشیاء من الزرع فیهلك هذا ویسلم هذا ویسلم هذا ویهلك هذا،

فلم یکن للناس کراء الا ھٰذا فلذالک زجر عنہ، واما شیٔ معلوم مضمون فلا باس بہ۔ (مسلم، ابوداؤد، نسائی)

"اصل بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لوگ اپنی زمینیں اجرت پر دیتے ہوئے یہ طے کیا کرتے تھے کہ پانی کی نالیوں کے سرے پر اور ان کے کناروں پر اور کھیت کے بعض مخصوص حصوں میں جو پیداوار ہوگی وہ مالک زمین لے گا۔ اب کبھی ایسا ہوتا کہ ایک جگہ کی کھیتی برباد ہوتی اور دوسری جگہ کی بچ جاتی اور کبھی اس جگہ کی بچ جاتی اور اُس جگہ کی برباد ہو جاتی۔ اُس زمانہ میں زمینیں کرائے پر دینے کا کوئی دوسرا دستور اس کے سوا نہ تھا۔ اسی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی کے ساتھ منع فرمایا۔ رہا ایک واضح اور متعین حصہ، تو اس پر معاملہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔"

حنظلہ بن قیس کی دوسری روایت میں رافع بن خدیجؓ کے الفاظ یہ ہیں:

کنا نکری الارض بالناحیۃ منہا مسمّی لسید الارض قال فمما یصاب ذالک وتسلم الارض ومما یصاب الارض ویسلم ذالک، فنھینا۔ واما الذھب والورق فلم یکن یومئذ۔ (بخاری)

"ہم لوگ زمینیں اس طرح کرایہ پر دیتے تھے کہ مالک زمین کھیت کے ایک خاص حصہ کی پیداوار کو اپنے لئے مخصوص کر لیتا تھا۔ اب کبھی ایسا ہوتا کہ اُسی حصہ پر آفت آجاتی اور باقی زمین بچ جاتی۔ اور کبھی ایسا ہوتا کہ وہی حصہ بچ جاتا اور ساری زمین پر آفت آجاتی۔ اسی لئے ہم کو ایسا معاملہ کرنے

سے روک دیا گیا۔ رہا سونا چاندی تو اس پر معاملہ کرنے کا اس زمانہ میں دستور ہی نہ تھا۔"

حنظلہ بن قیس کی تیسری روایت میں یہ ذکر ہے کہ حضرت رافعؓ نے فرمایا:۔

حدثنی عمای انہم کانوا یکرون الارض علی عہد النبی صلی اللہ علیہ وسلم بما ینبت علی الاربعاء او شئ یستثنیہ صاحب الارض فنہی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن ذالک۔ فقلت لرافع فکیف ھی بالدینار والدرھم فقال رافع لیس بھا باس بالدینار والدرھم۔ (بخاری، احمد، نسائی)

"میرے دو چچاؤں نے مجھ سے بیان کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں لوگ اپنی زمینوں کو اس پیداوار کے عوض کرایہ پر دیتے تھے جو پانی کی نالیوں پر پیدا ہو یا زمین کے کسی ایسے حصے میں پیدا ہو جسے مالک زمین مستثنیٰ کر لیتا تھا۔ اس طریقے کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرما دیا۔ اس پر میں نے رافع سے پوچھا کہ دینار اور درہم کے عوض معاملہ کرنا کیسا ہے؟ رافعؓ نے کہا اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

حضرت رافعؓ کی ایک اور روایت جو حنظلۃ الزُرقی کے واسطہ سے آئی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

کنا اکثر الانصار حقلاً، کنا نکری الارض علی ان لنا ھٰذہٖ ولھم ھٰذہٖ فربما اخرجت ھذہ ولم تخرج ھٰذہٖ فنھانا عن ذالک واما الورق فلم ینھنا (مسلم، ابن ماجہ، بخاری)

مگر بخاری میں اما الورق فلم ینھنا کے الفاظ نہیں ہیں)۔

"ہم لوگ انصار میں سب سے زیادہ کھیتی باڑی کرنے والے تھے ہم زمین اس طرح کرایہ پر دیا کرتے تھے کہ کھیت کے اس حصہ کی پیداوار ہماری اور اُس حصے کی پیداوار تمہاری۔ اب کبھی ایسا ہوتا کہ ایک حصے میں فصل ہوتی اور دوسرے میں نہ ہوتی۔ اس وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو یہ معاملہ کرنے سے منع فرما دیا۔ رہا چاندی کے عوض معاملہ کرنا تو اس سے آپ نے منع نہیں فرمایا۔

خود رافع بن خدیجؓ کے چچازاد بھائی اُسید بن ظہیرؓ روایت کرتے ہیں:۔

کان احدنا اذا استغنیٰ عن ارضہ او افتقر الیھا اعطاھا بالثلث والربع والنصف واشترط ثلث جداول والقصارۃ وما یسقی الربیع وکان العیش اذ ذاک شدیداً وکان یعمل فیھا بالحدید وبما شاء اللہ ویصیب منھا منفعۃ فاتانا رافع بن خدیج فقال ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نھاکم عن امر کان لکم نافعاً وطاعۃ اللہ وطاعۃ رسولہ انفع لکم ان رسول اللہ ینھاکم عن الحقل ویقول من استغنیٰ عن ارضہ فلیمنحھا اخاہ اولیدع۔ (ابوداؤد، احمد، نسائی، ابن ماجہ)

"ہم میں سے کوئی شخص جب اپنی زمین سے بے نیاز ہوتا، یا اُسے کرائے پر دینے کا حاجت مند ہوتا تو اسے تہائی یا چوتھائی یا نصف پیداوار کی

بٹائی پر دوسرے کو دے دیتا تھا اور ساتھ ہی شرط کر لیتا تھا کہ زمین نالیاں اور گانٹھیں (یا گھنڈیاں[1]) اور بڑی نالی کے کنارے کی پیداوار اس کی ہے۔ اس زمانہ میں زندگی بڑی سخت تھی۔ آدمی دن بھر ہل چلاتا یا دوسرا کام کرتا تب تھوڑا سا فائدہ حاصل کرتا تھا۔ ایک روز رافع بن خدیج ہمارے پاس آئے اور کہنے لگے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو ایسے کام سے روک دیا ہے جو تمہارے لئے نافع تھا۔ مگر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت تمہارے لئے زیادہ نافع ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو زمینیں کرایہ پر دینے سے منع فرماتے ہیں، اور آپ کا ارشاد ہے کہ جو اپنی زمین سے مستغنی ہو وہ یا تو اپنے بھائی کو مفت دے دے یا یونہی رہنے دے[2]

---

[1] لغت میں قُصارٰی اور قِصریٰ سے مراد ہے بقیۃ الحب فی سنبل بعد ما یُداس۔ یعنی وہ غلہ جو کھلیان کے بعد بالوں میں بچا رہتا ہے۔ مَیں خود ایک "غیر زراعت پیشہ" آدمی ہوں، اسلئے مجھے معلوم نہیں کہ اُردو میں اسے کیا کہتے ہیں۔ میرے جیل کے دونوں رفیق ماشاء اللہ زراعت پیشہ ہیں انکے اعتماد پر مَیں نے اس لفظ کا ترجمہ "گانٹھ" یا "گھنڈی" لکھ دیا ہے۔ گانٹھ کے راوی مولانا امین احسن صاحب ہیں اور گھنڈی کے راوی طفیل محمد صاحب۔ غالباً یہ فرق پنجاب اور یو۔پی کی اصطلاحوں کا ہے۔

[2] اس جگہ یہ معلوم کرنا بھی شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ رافع بن خدیج کی عمر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت بمشکل ۲۲ سال کی تھی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک انیس بیس سال کے نوجوان کا آنحضرتؐ کی بات کو سننے اور سمجھنے اور دوسروں سے جا کر روایت کرنے میں تھوڑی بہت غلطی کر جانا کچھ بہت زیادہ مستبعد امر نہ تھا۔

جابرؓ بن عبداللہ کی توضیح

رافع بن خدیج کی طرح حضرت جابرؓ بن عبداللہ سے بھی جب معاملہ کی تفصیلات دریافت کی گئیں تو اصل معاملہ جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا تھا، یہ کھلا:-

کنا نخابر علی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فنصیب من القصری ومن کذا ومن کذا، فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من کان لہ ارض فلیزرعہا او لیحرثہا اخاہ والا فلیدعہا۔ (احمد، مسلم)

"ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بٹائی پر زمینیں کاشت کے لئے دیتے تھے اور کچھ گانٹھوں (یا گھنڈیوں) میں سے اور کچھ اس چیز میں سے اور کچھ اُس چیز میں سے بھی وصول کرتے تھے۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کے پاس زمین ہو اُسے چاہیئے کہ یا خود کاشت کرے یا اپنے کسی بھائی کو کاشت کرا دے ورنہ اپنی زمین پڑی رہنے دے۔"

زیدؓ بن ثابت کی توضیح

حضرت زید رضؓ بن ثابت سے جب عُروہ بن زبیر نے معاملہ کی تحقیق کی تو انہوں نے فرمایا:-

یغفر اللہ لرافع بن خدیج انا واللہ اعلم بالحدیث منہ، انما اتی رجلان النبی صلی اللہ علیہ وسلم وقد اقتتلا

فقال ان کان ھٰذا شانکم فلا تکروا المزارع، فسمع رافع بن خدیج قولہ فلا تکروا المزارع۔ (ابوداؤد۔ ابن ماجہ)

"خدا معاف کرے رافع بن خدیج کو، مَیں اس بات کو ان سے زیادہ جانتا ہوں، اصل بات یہ تھی کہ دو آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے جن کے درمیان سخت جھگڑا ہوا تھا۔ اس پر حضور نے فرمایا اگر تم لوگوں کا یہ حال ہے تو اپنی زمینیں کرایہ پر نہ دیا کرو۔ رافع نے حضور کی بس اتنی بات سُن لی کہ "اپنی زمینیں کرایہ پر نہ دیا کرو"۔"

سعدؓ بن ابی وقاص کی توضیحات

حضرت سعدؓ نے اس معاملہ کی جو حقیقت بیان کی وہ یہ ہے :۔

ان اصحٰب المزارع فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کانوا یکرون مزارعھم بما یکون علی السواقی وما سعد بالماء مما حول النبت فجاؤا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاختصموا فی بعض ذالک فنھاھم ان یکروا بذالک وقال اکروا بالذھب والفضۃ۔ (احمد، نسائی)

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مالکانِ زمین کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنی زمینیں اس شرط پر زراعت کے لئے دیتے تھے کہ نالیوں کے دونوں جانب کی پیداوار، اور کھیتی کے اُس حصہ کی پیداوار جس پر پانی خود پہنچ جائے، مالک زمین کی ہوگی۔ اس پر لوگوں کے جھگڑے ہوئے اور اُن کے مقدمات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ تب آپ نے ایسی شرطوں پر زمینیں

دینے سے منع فرما دیا اور فرمایا کہ سونے اور چاندی کی شکل میں کرایہ طے کرو۔"

دوسری روایت میں وہ فرماتے ہیں:۔

کنا نکری الارض بما علی السواقی من الزرع وما سعد بالماء منہا فنہانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن ذالک وامرنا ان نکریہا بذہب او فضۃ۔ (ابوداؤد)

"ہم لوگ زمینیں اس شرط پر زراعت کے لئے دیتے تھے کہ کھیتی کا جو حصہ نالیوں کے کناروں پر ہے اور جس پر پانی خود پہنچ جائے اس کی پیداوار مالک کی ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا معاملہ کرنے سے ہم کو روک دیا اور حکم دیا کہ سونے اور چاندی کی شکل میں کرایہ طے کریں۔"

ابن عباسؓ کی توضیحات

تابعین میں جو فقہاء سب سے زیادہ مشہور رہیں ان میں سے ایک حضرت طاؤس ہیں۔ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے جو معلومات حاصل کی ہیں وہ اس مسئلے پر سے باقی ماندہ پردے بھی اٹھا دیتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:۔

لما سمع اکثار الناس فی کراء الارض قال سبحان اللہ، انما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الامنحہا احدکم اخاہ (ای قالہ تحریضاً للناس علی الاحسان) ولم ینہ عن کرائہا۔ (ابن ماجہ)

"ابن عباس نے جب کرایۂ زمین کے بارے میں سنا کہ لوگوں میں بہت

چہ میگوئیاں ہورہی ہیں تو انہوں نے کہا سبحان اللہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو صرف یہ فرمایا تھا کہ تم میں سے کوئی شخص اپنی زمین اپنے بھائی کو مفت کیوں نہیں دے دیتا (یعنی آپ لوگوں کو احسان کی ترغیب دینا چاہتے تھے) آپ نے کرایہ پر دینے سے منع نہیں فرمایا تھا۔"

دوسری مفصل روایت میں یہ ہے کہ طاؤس اپنی زمینیں بٹائی پر دیا کرتے تھے۔ اس پر مجاہد نے ان سے کہا کہ چلو رافع بن خدیجؓ کے بیٹے کے پاس چلیں، وہ اپنے والد سے ایک حدیث روایت کرتے ہیں۔ مگر طاؤس نے ان کو ڈانٹ دیا اور کہا خدا کی قسم اگر مجھے معلوم ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کام سے منع فرمایا ہے تو میں اسے ہرگز نہ کرتا۔ لیکن جو شخص رافع بن خدیجؓ سے زیادہ علم رکھتا ہے یعنی ابن عباسؓ، اس نے مجھ سے کہا کہ:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لان یمنح الرجل اخاہ ارضہ خیر لہ من ان یاخذ علیھا خرجا معلوما۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دراصل یہ فرمایا تھا کہ کوئی شخص اپنے بھائی کو یونہی زمین دے دے تو یہ اس سے زیادہ بہتر ہے کہ وہ اس پر ایک مقرر لگان لے۔"

دوسری روایت میں ابن عباسؓ کے الفاظ یہ ہیں:۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لم ینہ عنھا، انما قال یمنح احدکم اخاہ خیر لہ من ان یاخذ علیھا خرجا معلوما۔

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع نہیں فرمایا تھا۔ آپ نے تو صرف یہ فرمایا تھا کہ تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو یونہی زمین دے دے تو یہ اس کے حق میں زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ اس پر ایک مقرر لگان وصول کرے۔"

ایک اور روایت میں ابن عباس کے یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں :۔

لم یحرم المزارعة ولکن امران یرفق بعضہم ببعض۔

"حضورؐ نے مزارعت کو حرام نہیں کر دیا تھا۔ بلکہ آپؐ نے یہ ہدایت فرمائی تھی کہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رفاقت کا برتاؤ کریں۔" (بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی)

تحقیقِ مسئلہ

ان تمام شہادتوں اور عقلی و نقلی دلائل پر ایک جامع نگاہ ڈالنے سے مسئلے کی جو حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے وہ یہ ہے :۔

۱۔ اسلام اس تخیل سے قطعی نا آشنا ہے کہ زرعی جائداد کی ملکیت دوسری اقسام کی املاک اور جائدادوں سے کوئی الگ نوعیت رکھتی ہے جس کی بنا پر اُن سب کے برعکس اس کی جائز ملکیت کے لئے رقبے کے لحاظ سے کوئی حد مقرر کر دی جائے، یا یہ فیصلہ کر دیا جائے کہ ہر شخص اور خاندان کے قبضے میں صرف اُتنی ہی زمین رہنی چاہیئے جس میں وہ خود کاشت کر سکے، یا خود کاشتی سے زائد ملکیت کا حق دینے کے بعد دوسری ایسی پابندیاں لگا دی جائیں جن کی وجہ سے یہ حق بے معنی ہو کر رہ جائے۔ ایسی حد بندیوں کے لئے فی الحقیقت کتاب و سنت

میں کوئی اصل موجود نہیں ہے۔

۲۔ جو شخص خود کاشت نہ کرے، یا نہ کر سکتا ہو، یا خود کاشتی کی حد سے زائد زمین رکھتا ہو، اس کو شریعت نے یہ حق دیا ہے کہ اپنی زمین دوسرے لوگوں کو زراعت کے لئے دے اور پیداوار میں تہائی یا چوتھائی یا نصف، جس پر بھی فریقین میں معاہدہ ہو، اپنا حصہ مقرر کرلے۔ جس طرح تجارت اور صنعت اور دوسرے کاروباری معاملات میں مضاربت جائز ہے، بالکل اسی طرح زراعت میں مزارعت بھی جائز ہے۔

۳۔ لیکن مضاربت کی طرح مزارعت بھی صرف اپنی سادہ صورت ہی میں جائز ہے، یعنی یہ کہ مالک زمین اور کاشت کار کے درمیان حصے کا تعین سیدھے سیدھے طریقے سے اس طرح ہو کہ زمین میں جتنی پیداوار بھی ہو گی وہ اس تناسب سے فریقین میں تقسیم ہو جائے گی۔ اس کے ساتھ ایسی کوئی شرط لگانا جس سے ایک فریق کا حصہ متعین اور دوسرے کا حصہ مشتبہ ہو، یا جس میں کسی ایک کا یا دونوں کا حصہ محض بخت و اتفاق پر منحصر ہو جائے، پورے معاملہ کو ناجائز کر دیتا ہے، کیونکہ اس طرح کی شرطیں مزارعت میں سود خواری اور قمار بازی کی خصوصیات پیدا کر دیتی ہیں۔

۴۔ رہا نقد لگان، تو اگر وہ کرایۂ زمین کی نوعیت رکھتا ہو تو جائز ہے، لیکن اگر پیداوار کا تخمینہ کر کے مالکِ زمین اس میں اپنا حصہ پیشگی ایک مخصوص رقم کی شکل میں وصول یا متعین کرلے تو اصولاً اس میں اور سود خواری میں کوئی فرق نہیں۔ کرایہ میں لحاظ صرف اس امر کا ہونا چاہیئے کہ مالک اپنی چیز کو کرایہ دار کے لئے مہیا کرنے

اور مہیا رکھنے کا، اور اس نقصان کا جو کرایہ دار کے استعمال سے اس کی چیز کو پہنچتا ہے، معاوضہ طلب کرے۔ وہ چیز خواہ مکان ہو، یا فرنیچر، یا سواری یا زمین، بہرحال اس پہلو سے اس کا معاوضہ یقیناً لیا جا سکتا ہے، اور زیادہ نقصان دِہ یا کم نقصان دِہ استعمال کے لحاظ سے اس معاوضہ میں کمی وبیشی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر چیز کا مالک معاوضہ کا تعین اس لحاظ سے کرے کہ کرایہ دار میری چیز کو جس معاشی کاروبار میں استعمال کر رہا ہے اس میں اندازاً اُس کو اتنا نفع ہوگا، لہٰذا اُس میں سے مجھے اتنا معاوضہ لازماً ملنا چاہیئے، تو یہ پورا معاوضہ قطعی سود ہو جائے گا۔ خواہ وہ اس طریقے پر مکان کے معاملہ میں طے کیا جائے، یا سواری کے معاملہ میں، یا زمین کے معاملہ میں۔ کرایہ دار کے منافع میں حصہ لینے کی نیت جو شخص رکھتا ہو اُسے سیدھی طرح مضاربت کرنی چاہیئے اگر وہ تجارت وصنعت کے نفع میں شریک ہونا چاہتا ہے، یا مزارعت کرنی چاہیئے اگر وہ زراعت کے نفع میں حصہ بٹانا چاہتا ہے۔ لیکن ایک فریق کا حصہ ایک مخصوص رقم کی شکل میں معین ہو اور دوسرے کا حصہ مشتبہ اور بخت و اتفاق پر منحصر رہے، یہ نہ تجارت وصنعت میں جائز ہے اور نہ زراعت میں۔

فقہاء کے مذاہب

آخر میں ایک نظر یہ بھی دیکھ لیجیئے کہ اس مسئلے میں فقہائے اسلام کے مختلف مذاہب کا فتویٰ کیا ہے۔ علامہ شوکانی اپنی کتاب نیل الاوطار میں لکھتے ہیں:-

"حازمی کہتا ہے کہ حضرت علیؓ بن ابی طالب، عبداللہ بن مسعودؓ، عمارؓ بن یاسر، سعیدؒ بن مسیب، محمدؒ بن سیرین، عمرؒ بن عبدالعزیز، ابن ابی لیلیٰ، ابن شہاب زہری، اور حنفیہ میں سے قاضی ابو یوسف اور محمدؒ بن حسن کہتے

ہیں کہ کھیت کی پیداوار اور باغ کے ثمر سے، دونوں کی بٹائی پر مالک زمین اور کاشت کار کے درمیان اور مالکِ باغ اور باغبان کے درمیان معاملہ ہو سکتا ہے[1]۔ یہ دونوں معاملے ایک ساتھ بھی ہو سکتے ہیں جس طرح خیبر میں کیے گئے تھے کہ ایک ہی گروہ سے باغوں کی رکھوالی اور زمینوں کی کاشت کا معاملہ یکجا طے ہوا تھا، اور الگ الگ بھی ہو سکتے ہیں۔ جن احادیث میں مزارعت کی نہی وارد ہوئی ہے ان کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ وہ دراصل تنزیہ پر مبنی ہیں، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان سے مراد وہ صورت ہے جبکہ مالک زمین نے زمین کے کسی خاص حصے کی پیداوار اپنے لئے مخصوص کی ہو۔

اور طاؤس اور ایک قلیل گروہ کہتا ہے کہ زمین کا کرایہ مطلقاً ناجائز ہے خواہ وہ زمین کی پیداوار کے ایک حصے کی شکل میں ہو، یا سونے اور چاندی کی شکل میں، یا کسی اور صورت میں[2]۔ اسی رائے کی طرف ابن حزم

---

[1] ان بزرگوں کے علاوہ صحابہ میں سے حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، سعدؓ بن ابی وقاص، زبیرؓ بن العوام، اُسامہؓ بن زید، معاذؓ بن جبل، ابن عمرؓ، خبابؓ بن آرت، اور ابن عباسؓ سے اور فقہا میں طاؤس، اوزاعی اور ثوری سے بھی یہی مذہب منقول ہے۔ ان میں سے اکثر کے حوالے ہماری پچھلی نقل کردہ روایات میں گزر چکے ہیں۔

[2] تعجب ہے کہ طاؤس کی طرف مزارعت کے عدم جواز کا مسلک یہاں کیسے منسوب کر دیا گیا۔ طاؤس کا مذہب تو یہ تھا کہ وہ بٹائی کو جائز اور نقد لگان کو ناجائز کہتے تھے۔ (نیل الاوطار جلد ۵۔ ص ۲۴۶)

گئے ہیں اور انہوں نے بڑے زور سے اس کی تائید کی ہے اور اپنی حجت میں اُن احادیث سے استدلال کیا ہے جو اس کی مطلقاً ممانعت کرتی ہیں۔[1]

اور شافعیؒ اور ابو حنیفہؒ اور عترت (یعنی فقہائے امامیہ) اور بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ زمین کا کرایہ اُن تمام شکلوں میں طے کرنا جائز ہے جو اشیاء کی خرید و فروخت کے لئے قیمت کا کام دے سکتی ہیں، خواہ وہ سونا ہو، چاندی ہو، استعمالی سامان ہو، یا غلہ ہو۔ لیکن یہ کرایہ خود اُس زمین کی پیداوار کے ایک حصہ کی صورت میں طے نہیں کیا جا سکتا جو کرایہ پر دی جا رہی ہو۔ ابن المنذر کہتا ہے کہ سونے اور چاندی کی شکل میں زمین کا کرایہ طے کرنے کے جواز پر تو تمام صحابہ متفق ہیں۔ اور ابن بطال کہتا ہے کہ تمام فقہاء اَمصار بھی اس کے جواز پر متفق ہیں۔

---

[1] ابن حزم کی طرف بھی اس مذہب کی نسبت صحیح نہیں ہے۔ محلیٰ میں ابن حزم خود لکھتے ہیں:
"زمین کو نصف، ثلث یا ربع پیداوار کے بدلے بٹائی پر دینا حدیث خیبر سے ثابت ہے۔ یہ آپ کا آخری عمل تھا جو وفات تک جاری رہا اور آپ کے بعد ابوبکرؓ، عمرؓ اور تمام صحابہ نے اس پہ عمل درآمد کیا۔ لہٰذا یہ آپ کا آخری فعل ان تمام احادیث کے اُس حصے کا ناسخ ہو گا جن میں مزارعت کی مطلقاً ممانعت آئی ہے۔ باقی رہا انہی روایات کا وہ حصہ جس میں زمین کو نقد لگان پر دینے سے منع کیا گیا ہے، تو یہ ممانعت علیٰ حالہ قائم رہے گی، کیونکہ ان کا ناسخ کوئی عمل یا حکم نہیں ملتا" (المحلیٰ۔ جلد ۸۔ صفحہ ۲۱۴)

لیکن پیداوار کی بٹائی کے ناجائز ہونے پر مذکورۂ بالا اصحاب اُن احادیث سے استدلال کرتے ہیں جو اس کی ممانعت میں وارد ہوئی ہیں۔ اور خیبر کے معاملہ کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ خیبر تو بزورِ شمشیر فتح ہوا تھا اور اس کے باشندے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ہو چکے تھے، اس لئے اس کی پیداوار میں سے جو کچھ بھی آپ نے لیا وہ بھی آپ ہی کا تھا اور جو کچھ چھوڑ دیا وہ بھی آپ ہی کا تھا۔ حازمی کہتا ہے کہ یہ مذہب عبداللہؓ بن عمر اور عبداللہؓ بن عباس اور رافعؓ بن خدیج اور اسیدؓ بن حضیر اور ابوہریرہؓ اور نافعؓ سے مروی[1] ہے۔ اور اسی کی طرف مالکؒ اور شافعیؒ اور کوفیوں میں سے ابوحنیفہؒ گئے ہیں۔

امام مالکؒ کا مذہب یہ ہے کہ غلّے اور ثمرے کے سوا ہر دوسری صورت میں زمین کا کرایہ طے کرنا جائز ہے۔ غلّے اور ثمرے کی شکل میں کرایہ لینے سے وہ اس لئے منع کرتے ہیں کہ یہ معاملہ غلّے سے غلّے کی بیع نہ بن جائے اور ان کے نزدیک ممانعت کے احکام کا اصل منشا یہی ہے۔ فتح الباری کے مصنف نے ان کا مذہب اسی طرح نقل کیا ہے۔ مگر ابن المنذر کہتا ہے کہ امام مالک کے قول کا مطلب یہ لینا چاہیئے کہ اگر کرایہ اُس غلّے میں سے طے ہو جو کرایہ پر دی جانے والی زمین سے پیدا ہوگا، تو یہ ناجائز ہے، رہی یہ صورت کہ کرایہ پر لینے والا شخص

---

[1] ان میں سے اکثر بزرگوں کی طرف اس مذہب کی نسبت صحیح نہیں ہے۔

ایک مقرر مقدار غلہ ادا کرنے کا ذمہ لے یا موجودہ غلہ میں سے ادا کرے تو اس کے جواز میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔

امام احمدؒ بن حنبل کہتے ہیں کہ خود زمین ہی کی پیداوار میں سے ایک حصہ کرایے کے طور پر مقرر کرنا جائز ہے بشرطیکہ تخم مالکِ زمین کا ہو۔ امام احمدؒ کا یہ مذہب حازمی نے نقل کیا ہے[1]۔

حال میں الفقہ علی المذاہب الاربعہ کے نام سے ایک نفیس کتاب مصر سے شائع ہوئی ہے جس میں اسلامی فقہ کے چاروں مذاہب کے احکام نہایت عمدہ ترتیب اور تفصیل کے ساتھ ان کی اصل کتابوں سے لے کر درج کیے گئے ہیں۔ اس کی تیسری جلد کے آغاز میں مزارعت کے مسئلے پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ ذیل میں ہم اس کا ایک ضروری خلاصہ درج کرتے ہیں تاکہ ہر شخص خود دیکھ لے کہ اس مسئلے میں فقہائے اسلام کے مختلف مذاہب کا فتویٰ کیا ہے۔

مذہب حنفی کی تفصیل

"مزارعت" (یعنی بٹائی) دراصل مالک زمین اور عامل (کاشتکار) کے درمیان ایک ایسا معاہدہ ہے جس کی رو سے یا تو عامل زمین کو اُجرت پر لیتا ہے اس شرط کے ساتھ کہ وہ اس کی زمین میں کاشت کرے گا اور پیداوار کا ایک حصہ مالک زمین کو اجرت میں دے گا، یا مالکِ زمین عامل کی خدمات اُجرت پر لیتا ہے اس شرط کے ساتھ کہ وہ اس کی زمین میں کام کرے گا اور پیداوار کا ایک حصہ

---

[1] نیل الاوطار۔ جلد ۵۔ صہ ۲۳۲۔

اپنے کام کی اجرت میں پائے گا۔ اس نوعیت کا معاملہ حنفیہ میں مختلف فیہ ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ یہ ناجائز ہے۔ امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کہتے ہیں کہ یہ جائز ہے۔ اور مذہبِ حنفی میں فتویٰ انہی دونوں بزرگوں کے قول پر ہے نہ کہ امام ابوحنیفہؒ کے قول پر۔ لیکن خود امام ابوحنیفہؒ بھی مزارعت کو مطلقاً ناجائز نہیں فرماتے، بلکہ اُن کے نزدیک اگر مالک زمین صرف زمین ہی دے کر الگ نہ ہو جائے بلکہ تخم اور ہل بیل وغیرہ میں بھی عامل کے ساتھ شریک ہو تو اس صورت میں پیداوار کی بٹائی پر معاملہ کرنا جائز ہے۔

امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک (جس پر مذہب حنفی میں فتویٰ ہے) مزارعت کی جائز صورتیں یہ ہیں:-

(۱) یہ کہ زمین ایک کی ہو اور تخم، آلاتِ زراعت، اور عمل دوسرے کا ہو اور فریقین میں یہ قرارداد ہو جائے کہ زمین کا مالک پیداوار کا اتنا حصہ (مثلاً آدھا، تہائی یا چوتھائی) دے گا۔

(۲) یہ کہ زمین اور تخم اور آلاتِ زراعت سب کچھ مالک کا ہو اور صرف عمل دوسرے شخص کا ہو اور پھر یہ طے ہو جائے کہ عامل کو پیداوار میں سے اتنا حصہ ملے گا۔

(۳) یہ کہ زمین اور تخم مالک دے اور آلاتِ زراعت اور عمل دوسرے کا ہو، اور پھر بٹائی میں دونوں کے حصے کا تناسب طے ہو جائے۔

(۴) یہ کہ زمین بھی دونوں کی ہو، تخم بھی دونوں لائیں، آلات اور عمل میں بھی دونوں شریک ہوں، اور پھر آپس میں حصے مقرر کرلیں۔

اور اس معاملہ کی ناجائز صورتیں یہ ہیں۔

(۱) یہ کہ زمین دونوں فریقوں کی ہو، اور ایک فریق زمین کے ساتھ صرف بیج دے۔ اور دوسرا فریق زمین کے ساتھ صرف ہل بیل دے۔ (بعض علمائے اس صورت کے جواز کا فتویٰ دیا ہے اگر کسی علاقے میں اس طریقے کا رواج عام ہو)۔

(۲) یہ کہ ایک کی زمین ہو، دوسرے کا تخم ہو تیسرے کے ہل بیل ہوں اور چوتھے کا عمل ہو۔ یا ہل بیل اور عمل تیسرے کا ہو۔

(۳) یہ کہ تخم اور ہل بیل ایک کا ہو اور عمل اور زمین دوسرے کی ہو۔

(۴) یہ کہ زمین ایک کی ہو، اور تخم میں دونوں شریک ہوں، اور عمل کے بارے میں یہ شرط ہو کہ وہ مالکِ زمین کے سوا کوئی اور کرے گا۔

(۵) یہ کہ کسی ایک فریق کا حصّہ مقدار کی شکل میں (مثلاً ۵۰ من یا ۱۰۰ من) متعین کیا جائے، یا وہ بٹائی کے حصّے کے علاوہ ایک خاص مقدار غلّہ زائد لے، یا اس زمین کی پیداوار کے علاوہ کوئی اور جنس باہر سے فراہم کرکے دینے کی ذمہ داری کسی فریق پر ڈالی جائے۔

مذہبِ حنبلی

حنابلہ کا مذہب اس معاملہ میں تقریباً وہی ہے جو امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا ہے فرق صرف یہ ہے کہ وہ اس بات کو ضروری قرار دیتے ہیں کہ تخم مالکِ زمین مہیّا کرے۔

لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بعد میں مذہبِ حنبلی کے علمائے اس شرط میں کچھ

ترمیم کر دی۔ چنانچہ آگے چل کر جہاں الفقہ علی المذاہب الاربعۃ کا مصنف مذہبِ حنبلی کے تفصیلی احکام بیان کرتا ہے، وہاں وہ کہتا ہے:

"صحیح یہ ہے کہ تخم کا مالکِ زمین کی طرف سے ہونا شرط نہیں ہے۔ در اصل شرط یہ ہے کہ فریقین میں سے ہر ایک کچھ راس المال دے۔ پس یہ صورت بھی صحیح ہے کہ ایک شخص صرف زمین دے اور دوسرا شخص تخم اور عمل اور آلاتِ زراعت کے ساتھ شریک ہو۔ اور یہ بھی درست ہے کہ تخم یا ہل بیل یا دونوں مالکِ زمین کے ذمہ ہوں اور دوسرے کے ذمہ عمل اور تخم یا عمل اور ہل بیل ہوں"۔ (صا۲)

مذہبِ مالکی

مالکیہ کے نزدیک مزارعت کی یہ صورت جائز نہیں ہے کہ ایک شخص زمین دے، اور دوسرا تخم اور عمل اور آلات کے ساتھ شریک ہو، اور پیداوار کو دونوں فریق کسی طے شدہ تناسب کے مطابق آپس میں بانٹ لیں۔ اس کے بجائے مزارعت کی جو شکل وہ تجویز کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ زمین، عمل، اور آلاتِ زراعت میں سے ہر ایک کی ایک قیمت روپے یا اموالِ تجارت (باستثناء غلہ) کے حساب سے مشخص کی جائے۔ مثلاً یہ کہ زمین کو اتنی مدت تک استعمال کرنے کی قیمت پچاس روپے یا اتنے گز کپڑا ہے۔ اور اس مدت کے دوران میں جو زراعت کا عمل اس پر کیا جائے گا اس کی قیمت اتنے روپے یا اتنا کپڑا ہے۔ اور اس مدت میں آلاتِ زراعت جن سے کام لیا جائے گا ان کے استعمال کی قیمت اس قدر ہے۔ پھر جو فریق ان میں سے جس جس چیز کے ساتھ شریک ہوگا اس کے متعلق یہ قرار دیا

جائے گا کہ وہ گویا اتنے سرمایہ کے ساتھ اس مشترک کاروبار میں حصہ دار بن رہا ہے مگر تخم لازماً دونوں فریق برابر برابر لائیں گے۔ اور جو کچھ منافع اس مشترک کاروبار سے حاصل ہوگا وہ اُس سرمایہ کی نسبت سے فریقین کے درمیان تقسیم ہو جائے گا، جس کے ساتھ وہ شریک ہوئے ہیں۔

مذہب شافعی

شافعیہ کے نزدیک بٹائی کی تمام صورتیں ناجائز ہیں خواہ بیج اور زمین مالک دے یا بیج اور عمل کاشت کار کا ہو۔ ان کا خیال یہ ہے کہ زمین کی اُجرت خود اسی زمین کی پیداوار میں سے مقرر کرنا جائز نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں کاشت کار یہ جانے بغیر عمل کرتا ہے کہ اس کے حصے میں کتنا غلہ آئے گا، اس لئے یہ دھوکے کا سودا ہے۔ اس کے بجائے صحیح صورت یہ ہے کہ یا تو مالکِ زمین کاشتکار کی خدمات ایک مقرر اُجرت پر حاصل کرے اور کھیتی مالک کی ہو۔ یا پھر کاشتکار ایک مقرر اُجرت پر مالک سے زمین لے لے اور کھیتی کاشتکار کی ہو۔ یہ صاف صاف معاملہ کرنے کے بجائے ایسا معاملہ کیوں کیا جائے جس میں فریقین کو کچھ معلوم نہ ہو کہ ان کے حصے میں کتنا کچھ غلہ آئے گا؟ شافعیہ کا کہنا یہ ہے کہ احادیث میں مخابرۃ اور مزارعت کی جو ممانعت وارد ہوئی ہے اس کا مطلب یہی ہے۔

لیکن شافعیہ کے نزدیک یہ جائز ہے کہ ایک شخص اپنا باغ دوسرے کو رکھوالی کے لئے دے اور اُس کے عمل کی اُجرت مقرر کرنے کے بجائے ثمرے میں اس کا حصہ طے کرے۔ نیز ان کے نزدیک یہ بھی جائز ہے کہ اگر باغ میں کچھ

زمین زراعت کے لئے فارغ ہو تو اسی باغبان کو اُس میں زراعت کی بھی اجازت دے دی جائے اور باغ کا مالک اس کی پیداوار میں سے اپنا حصہ بٹائی کے طریقہ پر طے کرے۔ البتہ شرط یہ ہے کہ یہ مزارعت بجائے خود ایک مستقل معاملہ کے طور پر نہ ہو بلکہ اسی باغبانی کے معاملہ میں شامل اور اس کی تابع ہو، اور اسی شخص کے ساتھ طے ہو جس سے باغبانی کا معاملہ کیا گیا ہے۔

اِن تفصیلات پر نگاہ ڈالنے سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ فرقۂ ظاہریہ کی ایک ذرا سی جماعت کو چھوڑ کر پوری اُمت کے ماہرینِ قانون میں سے کسی کا بھی یہ مسلک نہیں ہے کہ زرعی جائداد کی ملکیت کو صرف خود کاشتی کی حد تک محدود ہونا چاہیئے، یا یہ کہ خود کاشتی کی حد سے زائد جتنی زمین آدمی کے پاس ہو اسے مفت دینے یا ڈال رکھنے کے سوا کوئی تیسری صورت اس کے استعمال کی شریعت میں نہیں ہے۔ زائد زمین کی کاشت دوسروں سے کرانے کی کیا صورت جائز ہے اور کیا ناجائز، اس میں تو ضرور مختلف مذاہب کے درمیان اختلاف ہے، مگر فقہ کے ہر مذہب میں کوئی نہ کوئی صورت ایسی ضرور جائز ہے جس سے ایک آدمی اپنی زمین کی کاشت دوسرے سے کرا سکتا ہے۔

اِصلاح کے حُدود اور طریقے

کوئی شک نہیں کہ زمین کا موجودہ بندوبست نہایت ناقص اور غیر منصفانہ ہے۔ بلاشبہ زمینداری اور جاگیرداری اس قدر خرابیوں سے لبریز ہو چکی ہے کہ ہماری پوری معیشت اور معاشرت اس کے زہر سے متاثر ہو رہی ہے۔ اصلاح کی ضرورت یقیناً ہے اور بجائے خود اس معاملہ میں ہمارے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اس بگاڑ کو دُور ہونا چاہیئے۔ لیکن جو لوگ اصلاح کا نام لیتے ہیں انہیں باہر کے بگاڑ کی فکر کرنے سے پہلے اپنے اندر کے بگاڑ کی فکر کرنی چاہیئے، کیونکہ ایک ناصاف اور اُلجھے ہوئے ذہن کو لے کر اگر وہ باہر اصلاح کی قینچی چلانا شروع کریں گے تو پچھلی خرابیوں کو دُور کرنے کے بجائے نئی خرابیوں کا ایک اور گورکھ دھندا پیدا کر دیں گے۔

سب سے پہلے تو ان کو یہ طے کرنا چاہیئے کہ ان کا کوئی دین ہے یا نہیں، اور ہے تو وہ اسلام ہے یا کچھ اور؟ اگر ان کا کوئی دین نہ ہو، یا ہو مگر وہ اسلام کے سوا کچھ اور ہو، تو انہیں پورا حق ہے کہ اصلاح کے لئے اپنا کوئی طبعزاد نظریہ پیش کریں یا کہیں اَور سے کوئی نظریہ اخذ کریں اور اسے رائج کرنے کی کوشش شروع کر دیں۔ مگر یہ سب کچھ بہر حال انہیں اپنے ہی نام سے کرنا چاہیئے، یا اپنے اُس پیشوا کے نام سے جس کی وہ پیروی کر رہے ہوں۔ یہ حق انہیں کسی طرح بھی نہیں

پہنچتا کہ اپنی من گھڑت یا دوسروں کی ایجاد کردہ تجویزوں کو زبردستی کھینچ تان کر اسلام کے سر منڈھیں اور اُس کے نام سے مسلمانوں کو دھوکا دینے کی کوشش کریں۔
اور اگر وہ اپنا کوئی دین رکھتے ہوں اور وہ اسلام ہی ہو، لیکن وہ عملاً اُس کی پیروی نہ کرنا چاہتے ہوں تب بھی انہیں معصیت کا اختیار تو ضرور حاصل ہے مگر کم ازکم معقولیت کے حدود میں تو اس کی گنجائش نہیں ہے کہ اسلام سے ہٹ کر اور اس کو نظر انداز کر کے جو تجویزیں وہ خود گھڑیں یا کہیں اور سے لائیں انہیں خواہ مخواہ عین اسلام قرار دیں۔

پھر اگر وہ یہی طے کریں کہ فی الواقع ان کا ایک دین ہے اور وہ اسلام ہی ہے اور انہیں اس کی پیروی بھی کرنی ہے، تو اسلام کے نام پر کوئی اصلاح شروع کرنے سے پہلے اُن کو چند ابتدائی باتیں ضرور جان لینی چاہئیں۔ اُن کو جاننا چاہیئے کہ اسلام نے محض عدل و انصاف کے الفاظ ہی ہم کو نہیں دیئے ہیں بلکہ ان کے مفہومات اور تصورات اور عملی نقشے بھی ساتھ دے دیئے ہیں، لہٰذا اگر ہم اسلامی انصاف قائم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں صرف انصاف کا لفظ ہی اسلام کی لغت سے نہ لینا ہوگا بلکہ اس کا تصور اور اس کا عملی نقشہ بھی اسلام ہی کے قانون سے لینا پڑے گا۔ ان کو یہ بھی جاننا چاہیئے کہ اسلام کوئی بازیچۂ اطفال نہیں ہے کہ جن لوگوں نے اس کے نظام اور اصول اور قوانین کو سمجھنے میں اپنی عمر کا کوئی ذرا سا حصہ بھی صرف نہ کیا ہو وہ اِدھر اُدھر سے چند آیات اور چند احادیث جمع کر کے چند گھنٹوں کے اندر بڑے بڑے دینی مسائل کے مجتہدانہ فیصلے کر ڈالیں اور اُلٹا اُن لوگوں کو احمق بنانے کی کوشش کریں جنہوں نے اپنی

عمریں اس دین کے نظام اور احکام کو سمجھنے میں کھپا دی ہیں۔ یا چند نواب زادے اور چند وکیل اور بیرسٹر صاحبان بیٹھ کر سراسر دنیوی اغراض اور مصلحتوں کی بنیاد پر ایک اصلاحی اسکیم تصنیف کریں اور پھر اسلام کے نام سے اس کو محض پیش کر دینے ہی پر اکتفا نہ کریں بلکہ دھڑلّے کے ساتھ یہ بھی فرما دیں کہ جو مولوی اور ملّا اس کے مطابق فتویٰ دے بس وہی دین کو جانتا ہے۔ یہ محض جہالت ہی نہیں، جہل مُرکب ہے۔ اس طرح کے مصلحین کو جاننا چاہیئے کہ یہ رویہ کسی معقول آدمی کو زیب نہیں دیتا۔ ان کو جاننا چاہیئے کہ اسلام ایک باقاعدہ نظام ہے جو اپنا ایک مستقل فلسفۂ زندگی، اپنے جامع اور ہمہ گیر اصول اور اپنے مخصوص ضوابط اور قوانین رکھتا ہے اور کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس کا علم حاصل کیئے بغیر جو کچھ چاہے اپنے دل سے گھڑ کر یا دوسری جگہ سے لا کر اُس کے نظام میں کھپا دے، یا ایک سرسری سی واقفیت کے بل بوتے پر مجتہد مطلق بن بیٹھے اور اپنے ذہن کی خام پیداوار کو قطعی اور حتمی فیصلوں کی صورت میں برآمد کرنا شروع کر دے۔ ان کو جاننا چاہیئے کہ موجودہ خرابیوں کی اصلاح اور ایک نئے صالح نظام کی تاسیس اگر ہم خود اپنی صوابدید سے کریں تو اس کو اسلام کی طرف منسوب کرنا غلط ہے، اور اگر یہ کام ہمیں اسلام کے طریقے پر کرنا ہو تو لامحالہ ہم کو ساری اصلاح و تاسیس اُن حدود کے اندر کرنی ہوگی جو اسلام نے مقرر کی ہیں اور اُن اصولوں کے مطابق کرنی ہوگی، جو اُس نے ہم کو دیئے ہیں۔

اِن پہلوؤں سے اگر لوگ اپنے ذہن کو صاف کر لیں اور ہر شخص اور گروہ اپنے حدودِ کار کو پہچان کر اپنی کارفرمائی اور کارگزاری کو اپنی اہلیت کی حد تک

محدود رکھے تو بہت سی وہ اُلجھنیں دُور ہو جائیں جن کی وجہ سے کام بننے کے بجائے اُلٹا بگڑ رہا ہے۔

اصلاح کے حدودِ اربعہ

اس کے بعد جو لوگ فی الواقع اسلامی اصلاح چاہتے ہیں اور من مانی کارروائیاں نہیں کرنا چاہتے اُن کی سہولت کے لئے ہم اِن صفحات میں اختصار کے ساتھ یہ واضح کریں گے کہ اسلامی قانون نے وہ کون سے حدود کھینچ رکھے ہیں جن کے اندر ہماری اصلاحی تدبیروں کو محدود رہنا چاہیئے، اُن حدود کے اندر کیا کچھ کرنے کی گنجائش ہے اور کیا کچھ کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

۱۔ قومی ملکیت کی نفی

سب سے پہلی چیز جو تمام اصلاح طلب عناصر کو صاف صاف سمجھ لینی چاہیئے وہ یہ ہے کہ ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کا تخیل بنیادی طور پر اسلام کے نقطۂ نظر کی ضد ہے۔ لہٰذا اگر ہمیں اسلامی اصول پر زمین کے بندوبست کی اصلاح کرنی ہو تو ایسی تمام تجویزوں کو پہلے قدم ہی پر لپیٹ کر رکھ دینا چاہیئے جن کی بنیاد میں قومی ملکیت کا نظریہ اُصول یا نصب العین کی حیثیت سے موجود ہو۔ بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ اسلام زبردستی مالکانِ زمین کی ملکیتیں چھین لینے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور بات صرف اتنی بھی نہیں ہے کہ وہ ایسے قوانین بنانے کی اجازت نہیں دیتا جن کے ذریعہ سے کسی شخص یا گروہ کو اپنی ملکیت حکومت کے ہاتھ بیچنے پر مجبور کیا جا سکے۔ بلکہ درحقیقت اسلامی نظریۂ تمدن و اجتماع سرے سے اس تخیل ہی کا مخالف ہے کہ زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار حکومت کی ملکیت ہوں اور پوری

سوسائٹی اس مختصر سے حکمران گروہ کی غلام بن کر رہ جائے جو ان ذرائع پر متصرف ہو۔ جن ہاتھوں میں فوج اور پولیس اور عدالت اور قانون سازی کی طاقتیں ہیں اُن ہی ہاتھوں میں اگر سوداگری اور کارخانہ داری اور زمینداری بھی سمٹ کر جمع ہو جائے تو اس سے ایک ایسا نظامِ زندگی پیدا ہوتا ہے جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا ہے۔ اس لیئے یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ اگر غاصبانہ طریقوں سے زمینوں پر قبضہ نہ کیا جائے بلکہ پورے پورے معاوضے دے کر حکومت تمام زمینوں کو ان کے مالکوں سے برضا و رغبت خرید لے تو اسلامی نقطۂ نظر سے اس میں کوئی قباحت نہیں جزئیاتِ شرع کے لحاظ سے چاہے اس میں قباحت نہ ہو، مگر کلیاتِ شرع کے لحاظ سے یہ تخیل ہی غلط ہے کہ عادلِ اجتماعی کی خاطر زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار کو انفرادی ملکیتوں سے نکال کر قومی ملکیت بنا دیا جائے۔ یہ انصاف کا اشتراکی تصور ہے نہ کہ اسلامی تصور۔ اور اس تصور کی بنیاد پر ایک اشتراکی معاشرہ پیدا ہوتا ہے نہ کہ اسلامی معاشرہ۔ اسلامی معاشرہ کے لیئے تو یہ نہایت ضروری ہے کہ اس کے اگر سب نہیں تو اکثر افراد اپنی معیشت میں آزاد ہوں اور اس غرض کے لیئے ناگزیر ہے کہ ذرائع پیداوار افراد ہی کے ہاتھوں میں رہیں۔

۲۔ تقسیمِ دولت میں مساوات کی نفی

دوسری چیز جو ہمارے اصلاح طلب حضرات کے ذہن نشین ہونی چاہیئے یہ ہے کہ اسلام دولت کی مساویانہ تقسیم کا قائل نہیں ہے بلکہ منصفانہ تقسیم کا

قائل ہے، اور اس منصفانہ تقسیم کے لئے بھی وہ انصاف کا اپنا ہی ایک مخصوص تصوّر رکھتا ہے۔ جہاں تک مساویانہ تقسیم کا تعلق ہے وہ محض ایک خیالی جنت ہے جس کا متحقق ہونا نظامِ فطرت میں کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ فطرت کے قوانین ہی کچھ اس طرح کے ہیں کہ اگر کسی وقت مصنوعی طور پر دولت کو سب انسانوں کے درمیان برابر برابر تقسیم کر بھی دیا جائے تو اُسی آن سے یہ مساوات عدمِ مساوات میں تبدیل ہوتی شروع ہو جائے گی یہاں تک کہ تھوڑی مدت گزرنے کے بعد اس مصنوعی مساوات کا کہیں نام و نشان تک باقی نہ رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ مساویانہ تقسیم کا نام لے کر اُٹھے تھے اُن کو بھی آخر کار اس خیال سے باز آجانا پڑا۔ اسلام اس طرح کی خام خیالیوں سے بہت بالا و برتر ہے۔ وہ تقسیم دولت میں مساوات کے بجائے انصاف قائم کرنا چاہتا ہے، اور اس انصاف کی ایک واضح اور مکمل صورت اس نے اپنے قوانین میں، اپنی اخلاقی ہدایات میں، اور اپنے معاشرے کی تشکیل میں قائم کر دی ہے۔ لہٰذا اگر ہم اسلامی طرز پر اصلاح کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں پہلے ہی قدم پر ایسی تمام تجویزوں کو رد کر دینا چاہیئے جن کا مقصود کسی قسم کی مصنوعی مساوات کا قیام ہو۔ اس کے بجائے ہماری اصلاحی تدبیروں کے لئے صحیح سمت یہ ہے کہ ہم انصاف کے اسلامی نقشے کو سمجھیں اور اپنے نظامِ معیشت و معاشرت میں اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں۔

۳۔ جائز حقوقِ ملکیت کی حرمت

تیسرا اہم نکتہ جس سے ہمارے اصلاح طلب بھائیوں کو غافل نہ رہنا چاہیئے

یہ ہے کہ اسلام کمیونزم کی طرح کا کوئی بگٹٹ بے لگام فلسفۂ زندگی نہیں ہے کہ چند آدمی بیٹھ کر اپنی جگہ اجتماعی فلاح و بہبود کا ایک خاص نظریہ قائم کریں اور پھر اندھا دھند طریقے سے ہر طرح کی جائز و ناجائز تدبیروں سے زبردستی اس کو دوسروں پر مسلط کرنا شروع کر دیں۔ وہ نہ کسی طبقے کے اغراض و مفاد کا وکیل ہے۔ نہ کسی دوسرے طبقے کے غصے اور جھنجھلاہٹ کا ترجمان۔ اس کی بنیاد خداترسی، عدل اور حق شناسی پر قائم ہے اور انہی بنیادوں پر وہ انسانی زندگی کا نظام استوار کرنا چاہتا ہے۔ اس کے نظام میں اس طرح کی باتوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے کہ آپ اصلاح کے نام سے جس کے حقوق پر چاہیں دست درازی کر بیٹھیں، جس سے جو کچھ چاہیں چھین لیں اور جس کو جو کچھ چاہیں دلوا دیں۔ ایک غیر ذمہ دار آدمی جو کسی خدا کا قائل نہ ہو اور جسے کسی کو حساب نہ دینا ہو، بے تکلف یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ ہم تمام زمینداریوں اور جاگیرداریوں کو مٹا دیں گے اور یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ ہم ان سب کو جوں کا توں قائم رکھیں گے۔ لیکن ایک مسلمان جو خداترسی کے کھونٹے سے بندھا ہوا ہے اور حدود اللہ کا پابند ہے، ان میں سے کوئی بات بھی نہیں کہہ سکتا۔ اسے تو یہ دیکھنا پڑے گا کہ خدا کی شریعت کی رُو سے کون جائز طور پر کسی چیز کا مالک ہے اور کس کی ملکیت جائز نہیں ہے۔ کون خدا اور رسول کے دیئے ہوئے حقوق سے صحیح طور پر متمتع ہو رہا ہے اور کون اپنے جائز حقوق کی حد سے تجاوز کر گیا ہے۔ پھر جائز و ناجائز کی پوری تمیز ملحوظ رکھتے ہوئے وہ تمام جائز شرعی ملکیتوں کو قائم رکھے گا، اور صرف ان ملکیتوں کو ختم کرے گا جو ناجائز نوعیت کی ہیں۔

۴۔ من مانی قیود کا عدم جواز

آخری چیز جو مسلمان مصلحین کی نگاہ میں رہنی ضروری ہے یہ ہے کہ اسلام کے حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع کی جائز ملکیتوں پر اصولاً نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عائد کر سکتے ہیں اور نہ ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں جو شریعت کے دیئے ہوئے جائز حقوق کو عملاً سلب کر لینے والی ہوں۔ اسلام جس چیز کا آدمی کو پابند کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو کچھ مال آئے جائز راستے سے آئے، جائز طریقے پر استعمال ہو، جائز راستوں میں جائے، اور خدا اور بندوں کے جو حقوق اس پر عائد کئے گئے ہیں وہ اس میں سے ادا کر دیئے جائیں۔ اس کے بعد جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو، اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔ پھر جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم صرف اُسی تجارت یا صنعت یا دوسرے کاروبار کے مالک ہو سکتے ہو جسے تم براہِ راست خود کرو، اور جس طرح اس نے دنیا کے کسی دوسرے معاملہ میں ہم پر یہ قید نہیں لگائی ہے کہ تم کسی ایسے کام پر حقوقِ ملکیت نہیں رکھ سکتے جس کو تم اُجرت پر یا شرکت کے طریقے پر دوسروں کے ذریعہ سے کر رہے ہو، اسی طرح وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بس وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے اور یہ کہ اُجرت یا شرکت پر کاشت کرانے والوں کو سرے سے زمین پر حقوقِ ملکیت حاصل ہی نہیں ہیں۔ اس قسم کی قانون سازیاں خود مختار لوگ تو کر سکتے ہیں، مگر جو

خدا اور رسول کے مطیع فرمان ہیں وہ ایسی باتیں سوچ بھی نہیں سکتے۔ زیادہ سے زیادہ اگر کسی خاص ضرورت کی بنا پر کچھ کیا جا سکتا ہے تو وہ ایک عارضی پابندی ہے جسے ہم آگے بیان کر رہے ہیں، مگر وہ اسلامی قانون میں کسی مستقل اصولی ترمیم کی موجب نہیں ہو سکتی۔

تدابیرِ اصلاح

یہ ہیں وہ سرحدیں جن کو پار کرنے کے ہم مجاز نہیں ہیں۔ اب ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ اصولِ اسلام کے مطابق ہم کس قسم کی اصلاحی تدابیر اختیار کر سکتے ہیں جن سے زمین کے انتظام کی موجودہ خرابیاں دُور ہوں اور وہ انصاف قائم ہو سکے جو اسلامی معیار کے لحاظ سے مطلوب ہے۔

۱۔ زمینداری و جاگیرداری کا معاملہ

ہمارے ملک میں یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے کہ بعض جگہ بہت بڑے بڑے رقبے جو ہزاروں سے گزر کر لاکھوں ایکڑ تک بھی وسیع ہیں، کچھ خاندانوں کے پاس جاگیر یا زمینداری کے طور پر مدتوں سے چلے آ رہے ہیں۔ اُن میں سے بعض وہ ہیں جو انگریزی حکومت نے ملک پر قابض ہونے کے بعد غداریوں کے صلے میں اصل حقداروں سے چھین کر دیئے تھے۔ بعض انگریزی دَور سے بھی پہلے مختلف زمانوں میں جا و بے جا طریقوں سے موجودہ مالکوں کے اسلاف کو عطا کیئے گئے تھے۔ بعض جزوی یا کلی طور پر خریدے بھی گئے تھے۔ اور بعض ایسے بھی تھے کہ سردارانِ قبائل نے گذشتہ صدیوں میں کسی وقت اُن پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان سب کے متعلق آج یہ تحقیق کرنا سخت مشکل ہے کہ کس کی ملکیت کس طرح شروع ہوئی، اور آیا وہ شرعاً جائز نوعیت کی تھی یا ناجائز

نوعیت کی۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اتنے بڑے بڑے رقبوں کی ملکیت سے، جن سب کا جائز ہونا بھی متحقق نہیں ہے، ہمارے نظام معیشت میں سخت ناہمواری پیدا ہوگئی ہے۔ اس حالت میں شرعاً یہ درست ہوگا کہ ایک عارضی تدبیر کے طور پر ملکیت کی ایک حد مقرر کردی جائے، اور اس حد سے زائد جو رقبے لوگوں کے پاس ہوں ان کو ایک منصفانہ شرح سے خرید کر آگے غیر مالک کاشتکاروں کے ہاتھ منصفانہ شرح پر فروخت کردیا جائے۔ لیکن یہ حد بندی نہ تو دائمی ہوسکتی ہے، کیونکہ اسے شریعت کے بہت سے قواعد کو بدلے بغیر مستقل بنانا ممکن نہیں ہے، اور نہ اس کو دائمی قانون بنا دینے کی کوئی ضرورت ہے، کیونکہ آئندہ کے لئے اگر اسلام ملک کا قانون ہو اور اس کے مطابق عملدرآمد ہونے لگے تو سرے سے وہ خرابیاں ہی پیدا نہیں ہوسکتیں جن کے لئے ایسی حد بندی کی کوئی ضرورت ہو۔

۲۔ قانونی زراعت پیشگی کا خاتمہ

ثانیاً ایسے تمام قوانین کا خاتمہ ہونا چاہیئے جن کی بدولت قانونی طور پر ایک مستقل "زراعت پیشہ طبقہ" پیدا کردیا گیا ہے، دیہاتی معاشرت میں معاشی اور معاشرتی حیثیت سے اس کے امتیازی حقوق قائم کردیئے گئے ہیں، اور "غیر زراعت پیشہ" طبقوں کے لئے زراعت پیشگی کے دائرے میں قدم رکھنا حرام کردیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ غیر اسلامی ہے، غیر معقول ہے، اور اُن بے شمار بے انصافیوں کا سرچشمہ ہے جو "نظام جاگیرداری" کی خصوصیات میں شمار ہوتی ہیں۔ زرعی جائدادوں کی خرید و فروخت پر سے تمام پابندیاں اُٹھ جانی چاہئیں۔ دوسری سب املاک کی طرح، اور خود شہری زمینوں کی طرح دیہاتی زمینیں بھی کھلے بندوں قابلِ بیع و شرا ہونی

چاہئیں شفعہ کے قوانین نے جو قطعی غیر اسلامی اور انتہا درجہ غیر معقول اور سخت مخرّبِ اخلاق صورت اختیار کر لی ہے اس کو منسوخ ہونا چاہیئے۔ زراعت کا پیشہ تمام دوسرے پیشوں کی طرح ہر بندۂ خدا کے لئے کھلا رہنا چاہیئے۔ اور گاؤں کی زندگی میں زمیندار کو از روئے قانون ایسی کوئی حیثیت حاصل نہ ہونی چاہیئے جس کی بدولت دوسرے سب اس کی رعیت اور اس کے ذلیل بن کر رہنے پر مجبور ہوں۔

۳۔ زرعی قوانین کی تدوینِ جدید

ثالثاً ایک ایسا زرعی قانون بننا چاہیئے جس کے ذریعہ سے مالکانِ زمین اور غیر مالک کاشتکاروں کے باہمی تعلق کو صحیح اور منصفانہ بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ مزارعت (بٹائی) ہو تو اس کو بالکل سیدھی سادھی شرکت کے اصول پر قائم ہونا چاہیئے اور از روئے قانون یہ طے ہو جانا چاہیئے کہ مزارعت کی کن کن صورتوں میں مالک اور مزارع کے درمیان زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم کس کس نسبت سے حصہ تقسیم ہو سکتا ہے۔ نقد کرایہ ہو یا مزدوری پر کاشت کرائی جائے تو اس میں بھی مالک اور مستاجر کے درمیان، اور مالک اور مزدور کے درمیان حقوق و فرائض کا تعین ہو جانا چاہیئے[۱]۔ یہ بھی طے ہونا چاہیئے کہ مالکانِ زمین کاشتکاروں سے اپنے

---

[۱] اگرچہ ان امور کو شریعت نے عُرف اور باہمی قرارداد پر چھوڑ دیا ہے، لیکن جہاں ظلم کی غیر معمولی صورتیں پیدا ہو گئی ہوں ایسی جگہ اسلامی حکومت کو اختیار ہے کہ انصاف قائم کرنے کے لئے ایسے امور میں مداخلت کرے اور واضح احکام مدوّن کر کے ظلم کی روک تھام کر دے۔

حصّے یا لگان کے علاوہ کوئی مال یا غلّہ یا خدمات لینے کے مجاز نہ ہوں گے۔ ناجائز طور پر اس طرح کی خدمات یا اشیاء بازبردستی کے جائے ہوئے رسمی حقوق وصول کرنے کو جرم قابلِ دست اندازی پولیس ہونا چاہیئے۔ بے دخلی اور فسخ معاملہ کے متعلق بھی قواعد مقرر ہونے چاہئیں کہ وہ کن کن صورتوں میں ہو سکتی ہیں اور کن کن صورتوں میں نہیں ہو سکتیں۔ نیز زمین کو بیکار ڈال رکھنے پر بھی شریعت کے احکام اور اسپرٹ کے مطابق پابندیاں عائد ہونی چاہئیں۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، جہاں تک موات اور حکومت کی عطا کردہ زمینوں کا تعلق ہے، ان کے بارے میں تو خود احکامِ شریعت ہی میں یہ تصریح ہے کہ تین سال سے زیادہ مدت تک اگر آدمی ان کو بے کار ڈال رکھے تو اس کے حقوق سوخت ہو جاتے ہیں۔ رہیں زرخرید زمینیں تو انہیں اُفتادہ چھوڑ دینے سے اگرچہ ملکیت ساقط نہیں ہو سکتی، لیکن اس پر ایسا کوئی تعزیری محصول ضرور لگایا جا سکتا ہے جس سے مالکانِ زمین کا یہ میلان کم ہو سکے کہ وہ کاشتکاروں سے من مانی شرطیں تسلیم کرانے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر کاشتکار نہیں مانتے تو اپنی زمین کو بے کار رکھ چھوڑنا زیادہ پسند کرتے ہیں بہ نسبت اس کے کہ کسی بندۂ خدا کو اس پر کام کرنے کا موقع دیں۔

۴۔ شرعی طریقے پر تقسیمِ میراث

رابعًا شریعت کے قانونِ میراث کو زرعی جائدادوں کے معاملے میں پوری قوت کے ساتھ نافذ کرنے کی کوشش کی جائے۔ موجودہ نسل ہی میں جو لوگ شرعًا حقدار ہیں اگر اُن کے اندر میراث کی تقسیم کو لازم کر دیا جائے تو بہت سی وہ بڑی بڑی جائدادیں جو پُرانے جاہلی رواج کی وجہ سے یکجا سمٹی ہوئی ہیں، مستحقین میں

بٹ جائیں گی اور دولت کے پھیلاؤ کا سلسلہ چل پڑے گا۔ اس صورت میں یہ جو اندیشہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ زمین اتنے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہو جائے گی جو معاشی حیثیت سے قابلِ عمل نہ رہیں گے یہ درحقیقت صحیح نہیں ہے۔ آپ زمین کی خرید و فروخت سے بے جا رکاوٹیں ہٹا دیجیے۔ مزارعت کیلئے عمدہ اور واضح طریقے مقرر کر دیجیے۔ اور "مشترک کاشت" (کوآپریٹو فارمنگ) کے طریقوں کو رواج دیجیے۔ اس کے بعد چاہے قانونِ میراث کی بدولت زمین تقسیم در تقسیم ہو کر ایک ایک گز کے ٹکڑوں میں ہی کیوں نہ بٹ جائے ایسی صورتِ حال کبھی پیدا نہ ہونے پائے گی جس میں یہ حصے ناقابلِ عمل ہو کر رہ جائیں۔ جن لوگوں کے پاس اس طرح کے چھوٹے ٹکڑے رہ جائیں گے وہ بآسانی اپنا حصہ بیچ سکیں گے، یا دوسروں کے حصے خرید سکیں گے، یا مناسب شرائط پر کاشت کے لئے دے سکیں گے، یا مشترک کاشت میں شریک ہو جائیں گے۔

۵۔ عُشر کی تحصیل و تقسیم کا نظم

خاصاً شریعت کے احکام کے مطابق اس امر کا انتظام ہونا چاہیئے کہ زرعی پیداوار کا عُشر اور زمینداروں کے مواشی کی زکوٰۃ باقاعدہ وصول ہو اور اسے شرعی مصارف میں صرف کیا جائے۔ اس کے مفصل احکام انشاء اللہ ہم اپنے رسالۂ زکوٰۃ میں عنقریب بیان کریں گے۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ اسلامی معیار کے مطابق انصاف قائم کرنے، اور قوم کے مختلف طبقات میں عداوت و نزاع کے بجائے الفت و موافقت پیدا کرنے کے لئے یہ ایک ضروری تدبیر ہے جس کے فوائد کسی دوسری تدبیر سے حاصل نہیں کئے جا سکتے۔

یہ ہے وہ اصل رُخ جس کی طرف ہماری اصلاحی کوششوں کو مڑنا چاہیئے۔ میں نے اس جگہ تمام ممکن تدابیر کا استقصار نہیں کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ صاحبِ علم اور تجربہ کار اصحاب اس پر مزید تجویزوں کا اضافہ کریں۔ میرا مدعا یہاں صرف یہ دکھانا تھا کہ اصلاحِ احوال کی مساعی کا صحیح رُخ وہ نہیں ہے جس کی طرف قلم اور قدم چل پڑے ہیں، بلکہ یہ ہے جس کی طرف اسلام ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ ط
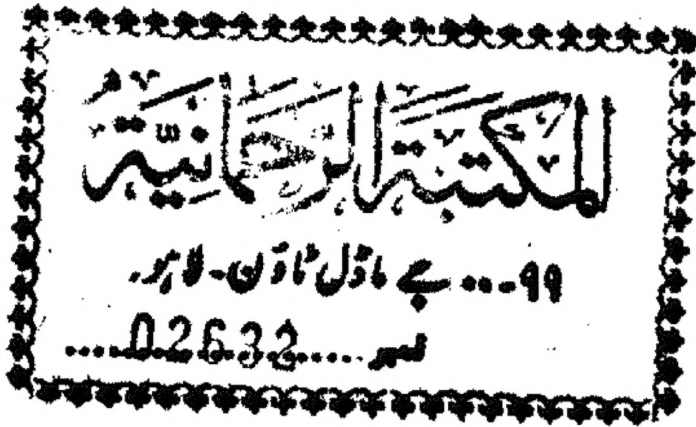
اسلام کے معاشی نظام پر چند معرکۃ الآراء کتب
اسلام اور
جدید معاشی نظریات
از سید ابوالاعلیٰ مودودی
موجودہ عمرانی مسائل کا تاریخی پس منظر،
جدید نظام سرمایہ داری، سوشلزم اور کمیونزم کا تجزیہ۔ اسلامی نظام معیشت کے بنیادی ارکان۔ جدید معاشی پیچیدگیوں کا اسلامی حل
قیمت: اعلیٰ ایڈیشن ۳/۵۰ سستا ایڈیشن ۱/۵۰ روپیہ
سود
مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی
حرمتِ سود
جدید بینکنگ اور تجارتی قرضوں کے متعلق اسلامی احکام اور مفصل بحث۔
قیمت: قسم اعلیٰ ۸/- روپے
سستا ایڈیشن ۵/ روپے
اسلام میں عدل اجتماعی
از۔ استاذ سید قطب (مصر)
ترجمہ:۔ محمد نجات اللہ صدیقی ایم اے
ایک ایسی کتاب جس نے عرب، یورپ اور امریکہ میں دھوم مچا دی جس کو عربی، انگریزی اور فرنچ کے بعد اردو میں پیش کیا جا رہا ہے۔
اسلام کے معاشی نظام پر ایک معرکۃ آراء کتاب
قیمت
انسان اور اس کے مسائل
(از مولانا جلال الدین انصر عمری)
ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کیا ہیں؟
انسانی مسائل کو اسلام کس طرح حل کرتا ہے
ان اہم موضوعات پر مفصل بحث
عمدہ کتابت و طباعت
قیمت: ۱/۶۰ روپیہ
اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

سرمایہ داری
اور
سوشلزم
کی خوشہ چینی کیوں؟
اسلام کا معاشی نظام
آپ کے معاشی مسائل کو کہیں بہتر طریقہ پر حل کرتا ہے
سید قطب شہید
کی معرکۃ آراء تالیف
اسلام میں عدلِ اجتماعی
(ترجمہ: العدالة الاجتماعية في الاسلام)
میں اسلام کے معاشی نظام کا مفصل نقشہ ملاحظہ فرمائیے
جس کو
ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی
نے رواں اور شگفتہ اُردو میں پیش کیا ہے۔
معاشیات کے طلباء اور مفکرین کے لیے ایک بہترین تحفہ
(مکمل نظر ثانی کے بعد تازہ ایڈیشن)
اعلیٰ ایڈیشن۔ ۵۰/۱۲ روپے ـــ صفحات ۵۰۶ ـــ سستا ایڈیشن۔ ۵۰/۸ روپے
اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ
۱۳۔ای شاہ عالم مارکیٹ، لاہور
۱۶۔بیت المکرم (پہلی منزل) ڈھاکہ
مسعود پرنٹرز۔ ۸۸ میکلوڈ روڈ لاہور